خطباتِ مدراس تسہیل و تخریج کے ساتھ

سیرت کا پیغام نوجوانوں کے نام



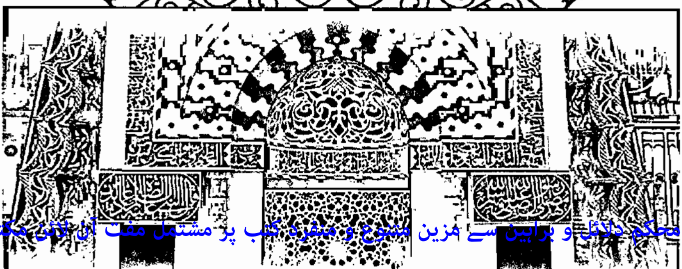
سیرتِ طیّبہ کی روشن روشن کرنوں سے منوّر خطبات

دار السلام
DARUSSALAM

سید سلیمان ندوی رحمہ اللہ

سیرت کا پیغام نوجوانوں کے نام

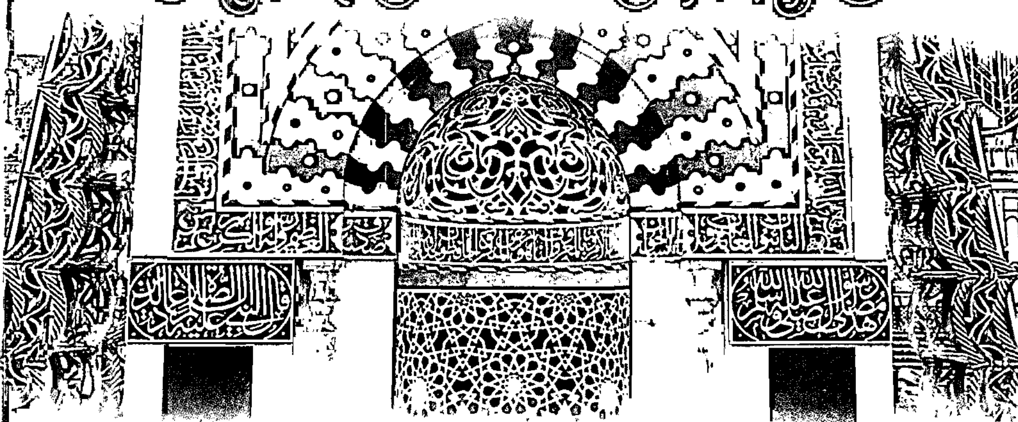
سیرتِ طیبہ کی روشن روشن کرنوں سے منور خطبات



© مكتبة دارالسلام، ١٤٣١ هـ
فهرسة مكتبة الملك فهد الوطنية أثناء النشر
ندوي، سيد سليمان
سيرة نبي الرحمن / الاردية. / سيد سليمان ندوي - الرياض، ١٤٣١ هـ
ص: ٢١٠ مقاس: ١٤×٢١ سم
ردمك: ٣-٦٨-٠٠٠-٩٩٦٠-٩٧٨

١. السيرة النبوية أ. العنوان
ديوي ٢٣٩ ١٤٣١/٦٢٩
رقم الإيداع: ١٤٣١/٦٢٩
ردمك: ٣-٦٨-٥٠٠-٩٩٦٠-٩٧٨

سیرت کا پیغام نوجوانوں کے نام



سیرت طیبہ کی روشن کرنوں سے منور خطبات

سید سلیمان ندوی رحمہ اللہ

دار السلام
DARUSSALAM

دارُالسّلام
کتاب وسنت کی اشاعت کا عالمی ادارہ
DARUSSALAM

سعودی عرب (ہیڈ آفس)

پوسٹ بکس:22743 الریاض:11416 سعودی عرب فون:4043432-4033962 1 00966 فیکس:4021659
E-mail: darussalam@awalnet.net.sa - riyadh@dar-us-salam.com
Website: www.darussalam.com

- الریاض۔ العلیا۔ فون:4614483 01 فیکس:4644945 • الملز فون:4735220 01 فیکس:4735221 • سویلم فون:2860422 01
- مندوب الریاض: موبائل:0503459695-0505196736 • قصیم (بریدہ): فون/فیکس:3696124 06 موبائل:0503417156
- مکہ مکرمہ: موبائل:0502839948-0506640175 • مدینہ منورہ فون:8234446 04 فیکس:8151121 موبائل:0503417155
- جدہ فون:6879254 02 فیکس: 6336270 • الخبر فون:8692900 03 فیکس:8691551
- ینبع البحر فون/فیکس:3908027 04 موبائل:0500887341 • خمیس مشیط فون/فیکس:2207055 07 موبائل:0500710328

شارجہ فون:5632623 6 00971 امریکہ • ہوسٹن فون:7220419 713 001 • نیویارک فون:6255925 718 001
لندن فون:4885 539 208 0044 آسٹریلیا فون:4040 9758 2 0061

پاکستان (ہیڈ آفس و مرکزی شوروم)

لاہور 36- لوئر مال، سیکرٹریٹ سٹاپ

فون:37110081-37111023-37232400-37240024 42 0092 فیکس:37354072 موبائل:0322-8484569
Website: www.darussalampk.com E-mail: info@darussalampk.com

- غزنی سٹریٹ، اُردو بازار، لاہور فون:37120054 فیکس:37320703 موبائل:0321-4439150
- مون مارکیٹ اقبال ٹاؤن فون:37846714 موبائل:0321-4156390
- Y-260 بلاک کمرشل ایریا، فیز III ڈیفنس، لاہور فون موبائل:0321-4212174

اسلام آباد F-8 مرکز، فون/فیکس:2281513 موبائل:0321-5370378

کراچی مین طارق روڈ، (D.C.HS / 110,111-Z) ڈالمن مال سے (بہادر آباد کی طرف) دوسری گلی، کراچی
فون:34393936 فیکس:34393937 موبائل:0321-2441843

فہرست

بسم اللہ الرحمن الرحیم

عرض ناشر

رسالت مآب ﷺ کی سیرت مقدسہ پر یہ معارف پرور کتاب علامہ سید سلیمان ندوی رحمہ اللہ کے خطبات مدراس کا دلکش مجموعہ ہے۔ سید صاحب نے یہ خطبات 1925ء میں مدراس یونیورسٹی اور دیگر کالجوں کے طلبہ کے اجتماع میں دیے تھے یہ کتاب پہلی دفعہ ''خطباتِ مدراس'' ہی کے عنوان سے شائع ہوئی تھی۔ آج بھی یہ اسی عنوان سے مارکیٹ میں جہاں تہاں موجود ہے۔ لیکن دارالسلام اسے پہلی مرتبہ خاص اہتمام سے نوجوانوں کے مطالعے کے لیے شائع کر رہا ہے تاکہ وہ اپنی سیرت کی تشکیل کے موجودہ مرحلے ہی میں اسوۂ حسنہ کے اُجالے سے فیض یاب ہوں اور نئی تہذیب کے نام سے پھیلی ہوئی اُن عالم گیر ظلمتوں سے محفوظ رہیں جن کی غارتگری نے انسان کی زندگی کو جہنم بنا دیا ہے۔ یہ کتاب بتاتی ہے کہ ہماری کامیابی اور عزت و منزلت کا واحد معیار یہ ہے کہ ہمارا اعتقاد اور عمل، عالمِ انسانیت کی سب سے بڑی شخصیت حضرت محمد ﷺ کی سیرتِ مقدسہ سے کس حد تک مزین و منور ہے؟ ہماری صفوں میں وہی آدمی سب سے زیادہ کامیاب اور مکرم قرار پائے گا جو سیرت نبوی کی پیروی میں سب سے آگے ہوگا۔

سید صاحب نے بتایا ہے کہ دنیا بھر کے اچھے اور بڑے انسانوں میں ایسی بے داغ سچائی کا حامل کوئی فرد نہیں گزرا جس کی عظمتِ کردار کا اعتراف اس کا معاشرہ ہی نہیں بلکہ اس کے اہلِ خانہ بھی کرتے ہوں۔ اتنی نادر انفرادیت صرف محمد رسول اللہ ﷺ

کے حصے میں آئی کہ انھیں وادیِ مکہ کا ہر فرد صادق و امین کے نام سے یاد کرتا تھا اور خانگی زندگی میں ان کی جلیل القدر ازواج بھی اُن کے حُسنِ کردار کی شیدا تھیں۔ صفحۂ ہستی پر صرف محمد رسول اللہ ﷺ ہی ہیں جنھوں نے اپنی بیویوں کو بے دریغ یہ حکم دے دیا کہ میری گھریلو زندگی کے تمام حالات و واقعات بے کم و کاست سب کے سامنے علی الاعلان بیان کرو۔ یہ کریکٹر کی بلندی اور سچائی کی گواہی کا اتنا کڑا معیار ہے کہ اس پر صرف سید البشر ﷺ ہی پورے اترے۔ اُن کے علاوہ کوئی اور انسان اِس پل صراط سے گزرنے کا حوصلہ نہ کر سکا۔ حق یہ ہے کہ بیوی سے بڑھ کر شوہر کے کردار کی جانچ پرکھ کا محرم اور ماہر اور کوئی نہیں ہو سکتا۔ سیدہ خدیجہ رضی اللہ عنہا نبوت ملنے سے 15 سال پہلے آپ ﷺ کے نکاح میں آئی تھیں۔ آپ ﷺ نے جونہی غار حرا کی بلندیوں سے اتر کر اپنی نبوت کا اعلان کیا، سیدہ خدیجہ رضی اللہ عنہا نے اپنی جگہ پر سنبھلے بغیر سب سے پہلے آپ ﷺ کے درخشاں کردار کی تصدیق کی اور فوراً اسلام قبول کر لیا۔

سید صاحب نے بتایا ہے کہ اس کے بعد وہ عہدِ سعادت شروع ہو گیا جو قیامت تک کے انسانوں کے لیے واحد سرچشمۂ ہدایت اور منبع کامیابی ہے۔ اب خلوت سے جلوت تک، گھر سے مسجد تک، مسجد سے بازار تک، منڈی سے مدرسے تک، مدرسے سے میدانِ حق و باطل تک اور صحنِ حرم سے ایوان حکومت تک ہر خاص و عام آدمی کے لیے عزت اور کامیابی کے حصول کا تنہا راستہ یہ ہے کہ سیرت محمدی ﷺ کی پیروی کی جائے۔ سید صاحب کی یہ بے مثل کتاب قطرے میں دجلہ کی بہترین دستاویز ہے۔

یہ تاریخ عالم کا سب سے زیادہ سچا اور محیر العقول واقعہ ہے کہ وادی غیر ذی زرع میں پیدا ہونے والے دُرِ یتیم کے پاس بے سروسامان ارادوں کے سوا کچھ نہ تھا۔ لیکن

اس نے اللہ رب العزت پر ایمان اور اپنی بے مثل سیرت کی درخشندگی کی بدولت کفر، شرک، جہالت، توہم پرستی، تعصب اور تنگ نظری کی تمام قوتوں کے سفینے ڈبو دیے اور توحید کا پرچم بلند کر کے انسانیت کے قدموں کو فوز وفلاح کی سیدھی اور سچی راہ پر ڈال دیا۔ محمد رسول اللہ ﷺ کے اس انقلابی کردار کے واقعات اِس کتاب میں جابجا بڑی وضاحت سے جگمگاتے نظر آئیں گے۔ اس لیے ہر انسان بالخصوص نوجوانوں کو یہ کتاب التزام سے پڑھنی چاہیے۔ صرف یہی منبعِ نور اور سرچشمۂ ہدایت ہے جس سے انھیں اپنی سیرت سازی اور مستقبل کی شاندار صورت گری میں بھرپور مدد مل سکتی ہے۔

دارالسلام کے قابل سکالرز جناب طارق جاوید عارفی اور جناب ڈاکٹر محمد افتخار کھوکھر نے اس مجموعۂ خطبات کے وہ تمام مشکل الفاظ تبدیل کر دیے ہیں جن پر 84 سال کی قدامت کا غبار چھایا ہوا تھا اور اس بُعد زمانی کی وجہ سے وہ فہم میں مشکل ہو گئے تھے۔ اسی طرح اس کتاب کا نقشِ اول تحقیق وتخریج سے بالکل خالی تھا۔ یہ کٹھن مرحلہ بھی جناب طارق جاوید عارفی ہی نے بخیر وخوبی طے کیا۔ موصوف نے تمام حوالوں کی تخریج کر کے اس پر استناد کی مہر لگا دی ہے۔ یوں یہ مبارک کتاب جناب عبدالواسع، گل رحمٰن اور خرم شہزاد کی کمپوزنگ، ہارون الرشید اور محمد شعیب کی ڈیزائننگ، منیر احمد رسولپوری کی پروف خوانی اور دارالسلام لاہور کے مدیر حافظ عبدالعظیم اسد کی سعیِ بلیغ سے منظر عام پر آ رہی ہے۔ اللہ تعالیٰ ان سب احباب کو اپنی رحمتوں سے سرفراز رکھے۔

خادم کتاب وسنت

عبدالمالک مجاہد

مدیر: دارالسلام، الریاض

نومبر 2009ء

ابتدائیہ

حضرات! مجھے موقع ملا ہے کہ ''مسلم ایجوکیشنل ایسوسی ایشن آف انڈیا'' کی طلب پر آپ کی خدمت میں حاضر ہوں اور یہاں آکر آپ کے سامنے سیرت نبوی ﷺ کے مختلف پہلوؤں پر خطبے دوں۔ان کی ترتیب یہ ہوگی:

- انسانیت کی تکمیل انبیائے کرام علیہم السلام کے ذریعے
- سیرتِ نبوی ﷺ اور عالمگیر نمونہ
- سیرتِ نبوی ﷺ کا تاریخی پہلو
- سیرتِ نبوی ﷺ انسانیت کا مکمل نمونہ
- سیرتِ نبوی ﷺ کامل ترین مثال
- سیرتِ نبوی ﷺ کا عملی پہلو
- سیرت نبوی ﷺ کا پیغام
- سیرت نبوی ﷺ اور ایمان وعمل

مسلم ایجوکیشنل ایسوسی ایشن مدراس نے اپنے نوجوانوں کو ایک ''سلسلۂ خطباتِ اسلامیہ'' کے ذریعے دین سے واقف کرنے کا جو طریقہ اختیار کیا ہے، وہ یقیناً ہندوستان

کے صوبوں میں ہماری اسلامی تعلیمی انجمنوں کا اس راہ میں پہلا قدم ہے۔ مدراس کی سرزمین پورے ہندوستان میں سب سے پہلا صوبہ ہے جہاں اسلام کی شعاعیں سب سے پہلے آکر چمکیں۔ اور یہ اس وقت ہوا جب ہندوستان کے کسی گوشے میں بھی اسلام کے کسی سپاہی کا قدم نہیں پڑا تھا۔ معجزۂ شق القمر کے چاند کی روشنی تھی جو بحرِ عرب سے گزر کر بحرِ ہند کے اس ساحل تک پہنچی اور دلوں کو روشن کر گئی۔ ''تحفۃ المجاہدین'' کی یہ روایت اگر صحیح ہے جس کی تائید ہمارے نو مسلم دوست ڈاکٹر غلام محمد کے بیان سے ہوتی ہے کہ انھوں نے خود مدراس میں آکر ہندوؤں کی ایک قلمی سنسکرت کتاب میں بھی اس واقعے کو درج پایا ہے اور جس کو انھوں نے چھپوا بھی دیا ہے تو ہمیں اس حالت میں مدراس کی ایک اسلامی تعلیمی انجمن کی اس قابلِ رشک سبقت پر کوئی تعجب نہیں ہے کہ مدراس کو اسلام کی خدمات میں پہل کرنے کا تاریخی حق آج سے نہیں بلکہ چودہ سو برس پہلے سے پہنچتا ہے۔ امید ہے کہ برصغیر کی دوسری اسلامی تعلیمی انجمنیں بھی اس کے نقشِ قدم پر چلیں گی۔

انسانیت کی تکمیل انبیائے کرام علیہم السلام کے ذریعے

دنیا کا یہ کارخانہ رنگا رنگ عجائبات سے بھرا ہوا ہے۔قسم قسم کی مخلوقات ہیں۔ ہر مخلوق کی علیحدہ علیحدہ صفات اور خاصیتیں ہیں۔ جمادات سے لے کر انسان تک اگر نظر ڈالیے تو معلوم ہوگا کہ بتدریج اورآہستہ آہستہ ان میں احساس، ادراک اور ارادے کی ترقی ہوتی جاتی ہے۔ جمادات کی ابتدائی قسم، مثلاً: ذرّات (ایٹمز) یا ایتھر ہر قسم کے احساس، ادراک اور ارادے سے خالی ہے۔ جمادات کی اور اقسام میں ایک طرح کی زندگی کا ہلکا سا نشان ملتا ہے۔ نباتات میں احساس کی ایک غیر ارادی کیفیت نشوونما کی صورت میں جلوہ گر معلوم ہوتی ہے۔حیوانات میں احساس کے ساتھ ارادے کی حرکت بھی ہے۔ انسان میں احساس، ادراک اور ارادہ پورے کمال کے ساتھ پایا جاتا ہے۔ یہی احساس، ادراک اور ارادہ ہماری تمام ذمہ داریوں کا اصلی سبب ہے۔مخلوق کی جس صنف میں جس حدتک یہ چیزیں کم ہیں، اسی حدتک ہی وہ ارادی فرائض کی ذمہ داریوں سے آزاد ہے۔ جمادات سرے سے ہر قسم کے فرائض سے محروم ہیں۔ نباتات میں زندگی اور موت کے کچھ فرائض پیدا ہوجاتے ہیں۔ حیوانات میں کچھ اور فرائض بڑھ جاتے ہیں۔ انسانوں کو دیکھیے تو وہ فرائض کی پابندیوں سے سراسر جکڑا ہوا ہے۔ پھر

انسان کے مختلف افراد پر نظر ڈالیے تو مجنون، پاگل، بے وقوف، بچے ایک طرف اور عاقل، بالغ، دانا، ہوشیار، عالم دوسری طرف۔ اسی احساس اور ارادے کی کمی بیشی کے لحاظ سے اپنے اپنے فرائض کچھ نہیں رکھتے یا رکھتے ہیں یا بہت زیادہ رکھتے ہیں۔

دوسری حیثیت سے دیکھیے کہ جس مخلوق میں احساس اور ارادے کی جتنی کمی ہے اتنی ہی فطرت اور قدرتِ الٰہی اس کی پرورش اور نشوونما کے فرائض کا بارخود اپنے اوپر اٹھائے ہوئے ہے اور جیسے جیسے مخلوق آنکھیں کھولتی جاتی ہے فطرت اس بار کو اس کے احساس و ادراک اور ارادے کے مطابق ہر صنف مخلوق پر ڈالتی جاتی ہے۔ پہاڑوں کے لعل و گوہر کی پرورش کون کرتا ہے؟ سمندر کی مچھلیوں کو کون پالتا ہے؟ جنگل کے جانوروں کی پرورش کا فرض کون انجام دیتا ہے؟ حیوانات کی بیماری اور گرمی سردی کی دیکھ بھال کون کرتا ہے؟ یہاں تک کہ سرد یا گرم مقامات کے رہنے والے حیوانوں اور پہاڑی، جنگلی اور صحرائی جانوروں میں بھی باوجود ایک ہی قسم کی نوع حیوان ہونے کے آب و ہوا کی مختلف ضروریات کی بنا پر آپ ان کی ظاہری حالتوں میں صاف فرق پائیں گے۔ یورپ کے کتے اور افریقہ کے کتے کی ضرورتوں میں موسم اور آب و ہوا کے سبب سے جو اختلاف ہے اس کا سامان بھی فطرت خود اپنی طرف سے کرتی ہے۔ اسی لیے مختلف آب و ہوا اور موسم کے ملکوں کے جانوروں میں پنجہ، بال، روئیں، کھال کے رنگ اور دیگر چیزوں میں اختلاف پائے جاتے ہیں۔

یہ تو فوائد و منافع کے حصول کی صورتیں اور شکلیں تھیں جن سے آپ کو یہ معلوم ہوگا کہ جہاں جس حد تک احساس اور ارادے کی کمی ہے، فطرت اور قدرت خود اس کی کفالت کرتی ہے اور جیسے جیسے مخلوقاتِ الٰہی درجہ بدرجہ بلوغ کے مرتبے کو پہنچ جاتی ہیں،

فطرت منافع کی صورتیں خود ان کے قُویٰ کے سپرد کر کے علیحدہ ہو جاتی ہے۔ انسان کو اپنی روزی کا سامان آپ کرنا پڑتا ہے۔ وہ کاشت کاری اور درختوں کے لگانے اور میووں کے پیدا کرنے کی محنت اٹھاتا ہے۔ سردی گرمی سے بچنے کے لیے اس کو فطری کھال روئیں اور اون نہیں دیے گئے، اس کا سامان مختلف لباسوں کی شکل میں اس کو خود کرنا ہوتا ہے۔ بیماریوں اور زخموں کو دور کرنے کے لیے اس کو خود کوشش کرنی پڑتی ہے۔

دوسری طرف دیکھیے کہ جہاں جس حد تک احساس اور ارادے کی کمی ہے، دشمنوں سے بچاؤ اور زندگی کی حفاظت کا سامان فطرت نے خود اپنے ذمے لے لیا ہے۔ مختلف جانوروں کو ان کی حفاظت کے لیے مختلف ذریعے دیے گئے ہیں، کسی کو تیز پنجے، کسی کو نکیلے دانت، کسی کو سینگ، کسی کو اُڑنا، کسی کو تیرنا، کسی کو تیز دوڑنے کی قوت، کسی کو ڈنک اور کسی کو دانتوں کا زہر۔ غرض مختلف آلات و اسلحہ سے خود فطرت نے ان کو مسلح کر دیا ہے۔ مگر غریب انسان کو دیکھو کہ اس کے پاس اپنے بچاؤ کے لیے نہ ہاتھی کے بڑے بڑے دانت اور سونڈ ہیں نہ شیروں کے نکیلے دانت اور پنجے، نہ بیلوں کے سینگ، نہ سانپوں کا زہر اور نہ بچھوؤں اور بھڑوں کے ڈنک۔ غرض ظاہری حیثیت سے وہ ہر طرح نہتا اور غیر مسلح بنایا گیا ہے مگر ان سب کی جگہ اس کو احساس اور ارادے کی زبردست قوتیں دی گئی ہیں اور یہی قوتیں اس کی ہر قسم کی ظاہری کمزوریوں کی تلافی کرتی ہیں۔ وہ اپنی انھی قوتوں سے بڑے بڑے دانتوں اور سونڈوں والے ہاتھیوں کو زیر کر لیتا ہے۔ تیز پنجے اور بڑے جبڑے والے شیروں کو چیر ڈالتا ہے۔ خوفناک زہریلے سانپوں کو پکڑ لیتا ہے، ہوا کے پرندوں کو گرفتار کر لیتا ہے۔ پانی کے جانوروں کو پھنسا لیتا ہے اور اپنے بچاؤ کے لیے سیکڑوں قسم کے ہتھیار، اسلحہ اور سامان پیدا کرتا رہتا ہے۔

آپ خواہ کسی مذہب اور کسی فلسفے کے معتقد ہوں، آپ کو یہ تسلیم کرنا ہوگا کہ آپ کی انسانی ذمے داریوں کا اصلی سبب آپ کے احساس اور ارادے کی قوتیں ہیں۔ اسلام میں ان ذمے داریوں کا شرعی نام تکلیف ہے۔ یہ تکلیف خود تمھارے اندرونی اور بیرونی قویٰ کے مطابق تم پر عائد ہے۔ اسلام اللہ تعالیٰ کا یہ اصول بتاتا ہے:

﴿ لَا يُكَلِّفُ اللّٰهُ نَفْسًا اِلَّا وُسْعَهَا ﴾

''اللہ کسی جان کو تکلیف نہیں دیتا مگر اس کی گنجائش کے مطابق۔''[1]

یہی ''تکلیف'' کی ذمے داری اور فرض ہے جو دوسری جگہ امانت کے لفظ سے قرآن مجید میں ادا ہوا ہے۔ یہ امانت کا بار جمادات، نباتات، حیوانات بلکہ بڑے بڑے پہاڑوں اور اونچے آسمانوں کے سامنے پیش کیا گیا لیکن ان میں سے کوئی اس کو اٹھا نہ سکا:

﴿ اِنَّا عَرَضْنَا الْاَمَانَةَ عَلَى السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ وَالْجِبَالِ فَاَبَيْنَ اَنْ يَّحْمِلْنَهَا وَاَشْفَقْنَ مِنْهَا وَحَمَلَهَا الْاِنْسَانُ ط اِنَّهٗ كَانَ ظَلُوْمًا جَهُوْلًا ۝ ﴾

''بے شک ہم نے امانت کو آسمانوں اور زمین اور پہاڑوں کے سامنے پیش کیا تو انھوں نے (فطری عدم صلاحیت کی بنا پر زبان حال سے) اس کے اٹھانے سے انکار کر دیا اور اس سے ڈر گئے اور انسان نے اس کو اٹھا لیا۔ بے شک وہ ظالم اور نادان تھا۔''[2]

''ظالم و نادان'' دیوانۂ عشق کی دوسری تعبیر ہے۔ ظالم، یعنی اپنی حد سے آگے بڑھ

[1] البقرة 2:286. [2] الأحزاب 33:72.

جانے والا۔ یہ صفت انسان کی عملی قوت کی بے اعتدالی کا اور ''جاہل و نادان'' ہونا اس کی عقلی و ذہنی قوت کی بے اعتدالی کا نام ہے۔ ''ظلوم'' کا مقابل ''عادل'' اور ''جہول'' کا مقابل ''عالم'' ہے۔ عدل اور علم جو بالفعل انسان کو حاصل نہیں، ان کو حاصل کرنے کے لیے اس کی عملی قوت میں عدل، یعنی میانہ روی اور اعتدال اور ذہنی قوت میں علم اور معرفت کی ضرورت ہے۔ قرآن مجید کی اصطلاح میں عدل کا دوسرا نام ''عمل صالح'' اور علم کا دوسرا نام ''ایمان'' ہے۔ ارشادِ الٰہی ہے:

﴿ وَالْعَصْرِ ۝ اِنَّ الْاِنْسَانَ لَفِيْ خُسْرٍ ۝ اِلَّا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَ عَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ ﴾

''زمانے کی قسم! بے شک انسان گھاٹے میں ہے لیکن وہ لوگ جو ایمان لائے اور انھوں نے نیک کام کیے۔''[1]

یہ نقصان اور گھاٹا وہی ظلمِ عملی اور جہلِ علمی ہے اور اس کا علاج ''ایمان'' یعنی علمِ صحیح اور ''عدل'' یعنی عمل صالح ہے۔ اس واقعے کی شہادت میں کہ انسانیت اس وقت تک گھاٹے اور خسارے میں ہے جب تک اس کو ایمان اور عملِ صالح کی توفیق نہ ملے، اللہ تعالیٰ نے زمانے کو پیش کیا ہے۔ زمانے سے مقصود وہ واقعات، حوادث اور آثار ہیں جو زمانے کے آغاز سے آج تک دنیا میں ظہور پذیر ہوئے ہیں۔ کارلائل کے مشہور فقرے کے مطابق ''تاریخ صرف بڑے لوگوں کی سوانح عمریوں کا سلسلہ ہے۔'' زمانے کی تاریخ خود اس بات پر گواہ ہے کہ دنیا میں وہ تمام قومیں اور قوموں کے وہ تمام افراد ہمیشہ گھاٹے اور خسارے میں رہے ہیں اور برباد اور ہلاک ہوئے ہیں جو ایمان اور عمل صالح سے محروم تھے۔

[1] العصر 103:1-3.

دنیا کے تمام آسمانی صحیفے، تمام مذہبی کتابیں، تمام اخلاقی قصے اورانسانوں کے بننے اور بگڑنے کی تمام حکایتیں، ظلم و جہل اور ایمان و عمل صالح کی دورنگیوں سے معمور ہیں۔ ایک طرف ظلم، جہل، شر، تاریکی اور دوسری طرف عدل، عملِ صالح، خیر اور نور کی حکایتیں، داستانیں اور تاریخیں ہیں۔ جن افراد نے ان انسانی ذمے داریوں کو قبول کیا، ان کی تعریف اوران سے جنھوں نے انکار کیا ان کی برائی کے بیانات ہیں۔ یونانی الیڈ، رومی پیرلل لاؤز، ایرانی شاہنامہ، ہندی مہابھارت، رامائن اور گیتا کیا ہیں؟ ہر قوم کے سامنے اس کے بڑے بڑے اشخاص اور اکابر رجال کی زندگیوں سے علم و جہل، ظلم و عدل، خیر و شر اور ایمان و کفر کی معرکہ آرائیوں کی عبرت آموز مثالیں ہی تو ہیں تاکہ ہر قوم ظلم و شر اور کفر کے برے نتائج سے بچ کر عدل، خیر اور ایمان کی مثالوں سے فائدہ اٹھائے۔

تورات، انجیل، زبور اور قرآن مجید کے بیشتر مضامین کیا ہیں؟ ظالم، شریر اور کافر قوموں اور افراد کی تباہی اور عادل، نیک اور مومن قوموں اور افراد کی سعادت اور فلاح و کامیابی کی مثالیں تاکہ ان کو سن کر ظالم عادل بنیں، شریر نیک ہوں اور کافر مومن بن جائیں۔ اسی لیے خاتم النبیین ﷺ سے پہلے ہر زمانے میں اور ہر ملک میں اللہ کے پیغمبر اور فرستادے آئے کہ وہ اپنی اپنی قوموں کے سامنے اپنی زندگی نمونے کے طور پر پیش کریں تاکہ ان کی پوری قوم یا اس کے نیک افراد فلاح اور کامیابی حاصل کریں اور آخر میں نبی ﷺ کو ''رحمتِ عالم'' بنا کر بھیجا گیا تاکہ وہ تمام عالم کے لیے دنیا میں اپنی زندگی کا نمونہ ہمیشہ کے لیے چھوڑ جائیں۔ نبی ﷺ کی زبان مبارک سے قرآن مجید نے یہ اعلان کیا:

﴿فَقَدْ لَبِثْتُ فِيكُمْ عُمُرًا مِّنْ قَبْلِهِ ۗ أَفَلَا تَعْقِلُونَ ۝﴾

''تو (اے قریشیو!) میں اس (دعوائے نبوت) سے پہلے تمھارے درمیان ایک عمر رہا ہوں، کیا تم نہیں سمجھتے؟''[1]

اس آیت میں درحقیقت وحیِ الٰہی نے خود اپنے پیغمبر کی سوانح عمری اور سیرت کو اس کی نبوت کے ثبوت میں پیش کیا ہے۔

بہرحال تاریخ کی دنیا میں ہزاروں، لاکھوں اشخاص نمایاں ہیں جنھوں نے آنے والوں کے لیے اپنی اپنی زندگیاں نمونے کے طور پر پیش کی ہیں۔ ایک طرف شاہانِ عالم کے شاندار دربار ہیں۔ ایک طرف سپہ سالاروں کے جنگی پرے ہیں۔ ایک طرف حکماء اور فلاسفروں کا متین گروہ ہے۔ ایک طرف فاتحینِ عالم کی پُرجلال صفیں ہیں۔ ایک طرف شعراء کی بزم رنگین ہے۔ ایک طرف دولت مندوں اور خزانوں کے مالکوں کی نرم گدیاں اور کھنکھناتی ہوئی تجوریاں ہیں۔ ان میں سے ہر ایک کی زندگی آدم کے بیٹوں کو اپنی طرف کھینچتی ہے۔ کارتھیج کا ہنی بال، مقدونیہ کا سکندر، روم کا سیزر، ایران کا دارا، یورپ کا نپولین، ہر ایک کی زندگی ایک کشش رکھتی ہے۔ سقراط، افلاطون، ارسطو، دیوجانیس اور یونان کے دوسرے مشہور فلسفیوں سے لے کر اسپنسر تک تمام حکماء اور فلاسفروں کی زندگیوں میں ایک خاص رنگ نمایاں ہے۔ نمرود، فرعون اور ابوجہل وابولہب کی دوسری شخصیتیں ہیں۔ قارون کی ایک الگ زندگی ہے۔

غرض دنیا کے اسٹیج پر ہزاروں قسم کی زندگیوں کے نمونے ہیں جو بنی آدم کی عملی زندگی کے لیے سامنے ہیں۔ لیکن بتاؤ کہ ان مختلف اصنافِ انسانی میں سے کس کی

[1] یونس 10:16.

زندگی نوعِ انسان کی سعادت، فلاح اور ہدایت کی ضامن اوراس کے لیے قابل تقلید نمونہ ہے۔

ان لوگوں میں بڑے بڑے فاتح اور سپہ سالار ہیں جنھوں نے اپنی تلوار کی نوک سے دنیا کے طبقے الٹ دیے ہیں، لیکن کیا انسانیت کی فلاح و ہدایت کے لیے انھوں نے کوئی نمونہ چھوڑا؟ کیا ان کی تلوار کی کاٹ میدان جنگ سے آگے بڑھ کر انسانی اوہام وخیالاتِ فاسدہ کی بیڑیوں کو بھی کاٹ سکی؟ انسانوں کے باہمی برادرانہ تعلقات کی گتھی بھی سلجھا سکی؟ انسانی معاشرت کا کوئی خاکہ پیش کرسکی؟ ہماری روحانی مایوسیوں اورناامیدیوں کا کوئی حل بتا سکی؟ ہمارے دلوں کی ناپاکی اور زنگ کو مٹا سکی؟ ہمارے اخلاق اوراعمال کا کوئی نقشہ بنا سکی؟

دنیا میں بڑے بڑے شاعر بھی پیدا ہوئے ہیں۔ خیالی دنیا کے یہ شہنشاہ عملی دنیا میں بالکل بے کار ثابت ہوئے۔ اسی لیے افلاطون کے مشہور نظام حکومت میں ان کے لیے کوئی جگہ نہیں رکھی گئی۔ ہومر سے لے کر آج تک فوری جوش و ہنگامہ کی پیدائش اور خیالی لذت ومصیبت کی افزائش کے سوانسلِ انسانی کو اس کی زندگی کی مشکلات دور کرنے کے لیے یہ لوگ کوئی صحیح مشورہ نہ دے سکے کیونکہ ان کی شیریں زبانیوں کے پیچھے ان کے اپنے حسنِ عمل کا کوئی خوش نما نمونہ نہ تھا۔ اسی لیے قرآن مجید نے بھی کہا ہے:

﴿ وَالشُّعَرَآءُ يَتَّبِعُهُمُ الْغَاوٗنَ ۝ اَلَمْ تَرَ اَنَّهُمْ فِیْ كُلِّ وَادٍ يَّهِيْمُوْنَ ۝ وَاَنَّهُمْ يَقُوْلُوْنَ مَا لَا يَفْعَلُوْنَ ۝ اِلَّا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ ﴾

”اور شاعر لوگ، ان کی پیروی گمراہ لوگ کرتے ہیں۔ کیا تو نے نہیں دیکھا کہ بے شک وہ ہر وادی میں سر مارتے پھرتے ہیں اور یہ کہ بے شک وہ کہتے ہیں

جو کرتے نہیں مگر وہ لوگ جو ایمان لائے اور انھوں نے نیک کام کیے۔''[1]

قرآن مجید نے ان کی شیریں زبانی کے بے اثر ہونے کا فلسفہ بھی بتا دیا کہ وہ خیالات کی وادیوں میں بھٹکتے رہتے ہیں اور ایمان و عمل صالح کے جوہر سے خالی ہوتے ہیں، لیکن اگر وہ اس دولت سے مالا مال ہوں تو کچھ نہ کچھ ان کی باتوں میں اثر ہوگا۔ تاہم وہ صلاح و ہدایت کے عظیم الشان فریضے کو ادا نہیں کر سکتے۔ دنیا کی تاریخ خود اس واقعے پر گواہ ہے۔

حکماء اور فلاسفر جنھوں نے عجائباتِ عالم میں اپنی عقل رسا سے نظامِ عالم کے نقشے بدل دیے ہیں۔ جنھوں نے عجائباتِ عالم کی طلسم کشائی کے حیرت انگیز نظریے پیش کیے ہیں، وہ بھی انسانیت کے نظام ہدایت کا کوئی عملی نقشہ پیش نہ کر سکے اور نہ فرائض انسانی کی ظلم کشائی میں کوئی عملی امداد دے سکے کہ ان کی بلند خیالیوں کے پیچھے بھی حسن عمل کا کوئی نمونہ نہ تھا۔ ارسطو نے فلسفۂ اخلاق کی بنیاد ڈالی۔ ہر یونیورسٹی میں اس کے خیالات پر بہترین لیکچر دیے جاتے ہیں اور اخلاقی مسائل میں اس کی نکتہ آفرینیوں کی داد دی جاتی ہے، لیکن سچ بتاؤ اس کو پڑھ یا سن کر کتنے افراد نوع انسانی کے راہ راست پر آئے۔ آج دنیا کی ہر یونیورسٹی میں اخلاقیات کے بڑے بڑے لائق پروفیسر اور اساتذہ موجود ہیں مگر ان کے علم اخلاق کے فلسفیانہ رموز و اسرار کا دائرۂ اثر ان درسگاہوں کی چار دیواریوں سے کبھی آگے بڑھ سکا؟ یا بڑھ سکتا ہے؟ اس لیے کہ جب ان کمروں سے نکل کر وہ باہر میدان میں آتے ہیں تو ان کی عملی زندگی عام افراد انسانی سے ایک انچ بھی بلند نہیں ہوتی اور انسان کانوں سے نہیں آنکھوں سے بنتا ہے۔

---

[1] الشعرآء 26:224-227.

دنیا کے اسٹیج پر بڑے بڑے بادشاہ اور حکمران بھی رونما ہوئے جنھوں نے کبھی کبھی پوری دنیا پر حکومت کی ہے۔ قوموں کی جان و مال پر وہ قابض ہوئے ہیں۔ ایک ملک کو اجاڑا اور دوسرے کو بسایا ہے۔ ایک قوم کو گھٹایا اور دوسری کو بڑھایا ہے۔ ایک سے چھینا اور دوسرے کو دیا ہے، مگر ان کا عام نقشہ وہی رہا ہے جس کو قرآن مجید نے ایک آیت میں ملکۂ سبا کی زبان سے ادا کیا ہے:

﴿ اِنَّ الْمُلُوْكَ اِذَا دَخَلُوْا قَرْيَةً اَفْسَدُوْهَا وَ جَعَلُوْٓا اَعِزَّةَ اَهْلِهَآ اَذِلَّةً ﴾

''بے شک بادشاہ جب کسی آبادی میں داخل ہوتے ہیں تو اس کو بگاڑ دیتے ہیں اور وہاں کے معزز باشندوں کو ذلیل کر دیتے ہیں۔''[1]

ان کی تلواروں کی دھاک نے آبادیوں اور مجمعوں کے مجرموں کو روپوش کر دیا لیکن تنہائیوں اور خلوت خانوں کے روپوش مجرموں کو باز نہ رکھ سکی۔ انھوں نے بازاروں اور راستوں میں امن و امان قائم کیا لیکن دلوں کی بستی میں وہ امن و امان قائم نہ رکھ سکے۔ انھوں نے ملکوں کا نظم و نسق درست کیا لیکن روحوں کی مملکت کا نظام ان سے درست نہ ہو سکا بلکہ ہر قسم کی روحانی بربادی ان ہی کے درباروں سے نکل کر ہر جگہ پھیلتی رہی۔ کیا سکندر اور سیزر جیسے بڑے بڑے بادشاہ بھی ہمارے لیے کچھ چھوڑ گئے؟

بڑے بڑے قانون دان سولن سے لے کر اس وقت تک پیدا ہوئے ہیں، لیکن ان کے قانون کی عمر نے بقا کی دولت نہ پائی اور اس کے ماننے والوں کو دل کی صفائی کا راز نہ ملا۔ دوسرے دور کے حاکموں اور عدالتوں نے خود اس کو حرف غلط سمجھ کر مٹایا اور اپنی مرضی اور اپنی مصلحتوں کے مطابق، نہ کہ انسانوں کی اصلاح کی خاطر، اس کی جگہ

[1] النمل 27:34.

دوسرا قانون بنالیا۔ آج بھی یہی حالت قائم ہے کہ آئین ساز مجلسیں بنائی گئی ہیں جو اپنے ہر اجلاس میں آج جو بناتی ہیں کل اس کو مٹاتی ہیں اور یہ سب کچھ انسانوں کی خاطر نہیں ہے بلکہ حکومتوں کی خاطر ہوتا رہتا ہے۔

عزیز دوستو! تم نے صنف انسانی کے بلند پایہ طبقوں میں سے جن سے انسانوں کی بھلائی اور بہتری کی توقعات ہوسکتی ہیں، ہر ایک کا جائزہ لے لیا۔ غور سے دیکھو! اس وقت دنیا میں جہاں کہیں بھی نیکی کی روشنی اور اچھائی کا نور ہے، جہاں کہیں بھی خلوص اور دل کی صفائی کا اجالا ہے، کیا وہ صرف انھی بزرگوں کی تعلیم اور ہدایت کا نتیجہ نہیں ہے جن کو تم انبیائے کرام علیہم السلام کے نام سے جانتے ہو؟ پہاڑوں کے غار، جنگلوں کے جھنڈ، شہروں کی آبادیاں، غرض جہاں بھی رحم، انصاف، غریبوں کی مدد، یتیموں کی پرورش اورنیکیوں کا سراغ ملتا ہے، وہ اسی برگزیدہ جماعت کے کسی نہ کسی فرد کی دعوت اور پکار کا دائمی اثر ہے۔ قرآن مجید کی تعلیم کے مطابق:

﴿ وَاِنْ مِّنْ اُمَّةٍ اِلَّا خَلَا فِيْهَا نَذِيْرٌ ۝﴾

''کوئی قوم نہیں جس میں کوئی انسانوں کو خبردار کرنے والا نہ گزرا ہو۔''[1]

ایک دوسرے مقام پر فرمایا:

﴿ وَّلِكُلِّ قَوْمٍ هَادٍ ۝﴾

''اور ہر قوم کے لیے ایک رہنما ہے۔''[2]

آج ہر قوم اور ہر ملک میں انھی کی برکتوں کا اجالا نظر آتا ہے اور ہر طرف انھی کی پکار اور آواز کی بازگشت سنائی دیتی ہے۔ افریقہ کے وحشی ہوں یا یورپ کے مہذب

[1] فاطر 35:24. [2] الرعد 13:7.

سب کے دلوں کی صفائی انھی کے سرچشموں سے ہوتی ہے اور ہو رہی ہے اور جتنے بلند پایہ اور عالی مرتبہ انسانی طبقوں کے نام آئے ہیں، ان میں سب سے بلند اور سب سے اعلیٰ وہ طبقہ ہے جو بادشاہوں کی طرح جسموں پر نہیں بلکہ دلوں پر حکومت کرتا ہے۔ اس کی حکمرانی کی زمین، دنیا کی مملکت نہیں بلکہ دلوں کی مملکت ہے جو گو سپہ سالاروں کی طرح تیغ بکف نہیں تاہم وہ گناہوں کے پرے اور آلودگیوں کی صفیں دم کے دم میں الٹ دیتا ہے۔ وہ گو خیالی شاعر نہیں لیکن اس کی شیریں بیانیوں کے ذائقے سے اب تک انسانوں کے کام و دہن لطف اٹھا رہے ہیں۔ وہ گو ظاہری طور پر قانون ساز اور مجلسوں کے سینیٹر نہ تھے۔ لیکن صدہا اور ہزار ہا سال گزر جانے کے بعد بھی ان کا قانون اسی طرح زندہ ہے جو خود حاکموں اور عدالتوں پر حکمران ہے اور بلاتفریق شاہ و گدا اور بادشاہ و رعایا سب پر یکساں جاری ہے۔

یہاں مذہب اور اعتقاد کا سوال نہیں بلکہ عملی تاریخ کا سوال ہے کہ آیا یہ واقعہ ہے یا نہیں؟ پاٹلی پتر کے راجہ اشوکا کے احکام صرف پتھر کی لاٹوں پر کندہ ہیں۔ مگر بدھ کے حکم دلوں کی تختیوں پر منقوش ہیں۔ اجین اور ہستناپور (دہلی) اور قنوج کے راجاؤں کے احکام مٹ چکے ہیں لیکن منو جی کا دھرم شاستر اب تک نافذ اور جاری ہے۔ بابل کے سب سے پہلے قانون ساز بادشاہ حمورابی کے قانونی دفعات مدت ہوئی کہ مٹی کے ڈھیر میں دفن ہو گئے مگر حضرت ابراہیم علیہ السلام کی تعلیم آج بھی موجود ہے۔ فرعون کی ندائے ﴿ أَنَا رَبُّكُمُ الْأَعْلَىٰ ۝ ﴾ کتنے دن قائم رہی؟ مگر حضرت موسیٰ علیہ السلام کے اعجاز کا آج بھی زمانہ معترف ہے۔ سولن کے بنائے ہوئے قانون کتنے دن چل سکے؟ مگر تورات کا آسمانی قانون آج بھی انسانوں میں عدل کا ترازو ہے۔ وہ رومن لاء جس نے حضرت

عیسیٰ علیہ السلام کو عدالت میں گناہ گار ٹھہرایا تھا، صدیاں گزریں کہ معدوم ہو چکا، مگر حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی تعلیم و تربیت اور ہدایت آج بھی گناہ گاروں کو نیک اور مجرموں کو پاک بنانے میں اسی طرح مصروف ہے۔ مکہ کے ابوجہل، ایران کے کسریٰ اور روم کے قیصر کی حکومتیں مٹ گئیں مگر شاہِ مدینہ صلی اللہ علیہ وسلم کی فرماں برداری قائم اور مسلّم ہے۔

دوستو! گفتگو نے اگر تمھارے دلوں میں تشفی اور تسلی کا کوئی اثر پیدا کیا ہے تو صرف اپنے عقیدے سے نہیں بلکہ عقلی استدلال اور دنیا کی عملی تاریخ سے تمھارے دلوں میں یہ یقین پیدا ہوگا کہ بنی نوع انسان کی حقیقی بھلائی، اعمال کی نیکی، اخلاق کی بہتری، دلوں کی صفائی اور انسانی قویٰ میں اعتدال اور میانہ روی پیدا کرنے کے لیے کامیاب کوششیں اگر کسی طبقۂ انسانی نے انجام دی ہیں تو وہ صرف انبیائے کرام علیہم السلام کا طبقہ ہے جو اللہ تعالیٰ کے فرستادہ ہو کر دنیا میں آئے اور دنیا کو نیک تعلیم اور ہدایت دے کر اپنے بعد بھی لوگوں کے لیے چلنے کا ایک راستہ بنا کر چھوڑ گئے جن کی تعلیم و عمل کے سرچشمے سے بادشاہ و رعایا، امیر و غریب اور جاہل و عالم سب برابر کا فیض پا رہے ہیں۔ سورۃ الانعام میں ارشاد ربانی ہے:

''اور ہم نے ابراہیم (علیہ السلام) کو اس کی قوم پر (اپنی حجت پیش کرنے کے لیے) یہ دلیل عنایت کی، ہم جس کو چاہتے ہیں درجات میں بلند کر دیتے ہیں۔ بے شک تیرا پروردگار بڑی حکمت والا اور بڑے علم والا ہے۔ اور ہم نے اس (ابراہیم علیہ السلام) کو اسحاق اور یعقوب عطا کیے، ہر ایک کو (ان میں سے) ہدایت بخشی اور ہم نے اس (ابراہیم علیہ السلام) سے پہلے نوح علیہ السلام کو ہدایت دی اور اس (ابراہیم علیہ السلام) کی نسل سے داود اور سلیمان اور ایوب اور یوسف اور موسیٰ اور

ہارون (علیہم السلام) کو (ہدایت دی) اور ہم نیکو کاروں کو ایسا ہی بدلہ دیتے ہیں۔ اور زکریا اور یحییٰ اور عیسیٰ اور الیاس (علیہم السلام) کو ہدایت دی، یہ سب نیک لوگوں میں سے تھے۔ اور اسماعیل اوریسع اور یونس اور لوط (علیہم السلام) کو (ہدایت دی) اوران میں سے ہر ایک کو (دنیا میں اس کے زمانہ کے لوگوں پر) فضیلت بخشی اوران کے بزرگوں اوران کی اولاد اوران کے بھائیوں میں سے ان کو چنا اوران کو سیدھے راستے کی طرف ہدایت کی۔ یہی اللہ تعالیٰ کی ہدایت ہے، اپنے بندوں میں جس کو چاہتا ہے اسے ہدایت دیتا ہے۔ اگر وہ شرک کرتے تو ان کے سارے کام برباد جاتے۔ یہی وہ لوگ ہیں جن کو ہم نے کتاب، قوتِ فیصلہ اور پیغمبری دی۔ تو اگر یہ لوگ (جو اُن کے نام لیوا آج موجود ہیں) ان نعمتوں کی ناشکری کریں تو ہم نے ان نعمتوں کو ایسے لوگوں (مسلمانوں) کے سپرد کردیا جو ان کی ناقدری نہیں کرتے ہیں۔ یہی لوگ ہیں جن کو اللہ نے ہدایت دی، اس لیے آپ بھی انھی کی ہدایت کی پیروی کریں۔“ [1]

ان آیات میں انسانوں کی ہدایت اور رہنمائی کے لیے اصناف انسانی میں سے ایک خاص طبقے کے بیشتر افراد کے نام بتائے گئے ہیں جن کی پیروی اور تقلید ہماری روحانی بیماریوں اور اخلاقی کمزوریوں کا علاج ہے۔ یہی وہ مقدس گروہ ہے جو اللہ کی بسائی تمام آبادیوں میں پھیلا اور مختلف زمانوں میں اپنی تعلیم و ہدایت کا چراغ روشن کرتا رہا۔ آج انسان کے سرمایہ میں فلاح، سعادت، اخلاق، نیک اعمال اور بہترین زندگیوں کے جو کچھ اثر و نتائج ہیں، وہ سب انھی بزرگوں کے فیوض و برکات ہیں۔ وہ

[1] الأنعام6:83-90.

جگہ جگہ اپنے نقش قدم چھوڑ گئے اور دنیا کم و بیش انھی پر چل کر اپنی کوششوں کی کامیابی ڈھونڈ رہی ہے۔

نوح علیہ السلام کا جوشِ تبلیغ، ابراہیم علیہ السلام کا ولولۂ توحید، اسحاق علیہ السلام کی وراثتِ پدری، اسماعیل علیہ السلام کا ایثار، موسیٰ علیہ السلام کی سعی و کوشش، ہارون علیہ السلام کی رفاقتِ حق، یعقوب علیہ السلام کی تسلیم، داود علیہ السلام کا غربتِ حق پر ماتم، سلیمان علیہ السلام کا سرودِ حکمت، زکریا علیہ السلام کی عبادت، یحییٰ علیہ السلام کی عفت، عیسیٰ علیہ السلام کا زہد، یونس علیہ السلام کا اعترافِ قصور، لوط علیہ السلام کی جانفشانی، ایوب علیہ السلام کا صبر۔ یہی وہ حقیقی نقش و نگار ہیں جن سے ہماری روحانی اور اخلاقی دنیا کا ایوان آراستہ ہے اور جہاں کہیں ان صفاتِ عالیہ کا وجود ہے، وہ انھی بزرگوں کی بہترین مثالوں اور نمونوں کا عکس ہے۔

انسانوں کی عمدہ معاشرت، صحیح تمدن اور اعلیٰ مسرت کی تکمیل اور کائنات کے اندر اس کو اشرف المخلوقات کا مرتبہ حاصل کرانے میں یقیناً تمام کارکن طبقات انسانی کا حصہ ہے۔ ہیئت دانوں نے ستاروں کی چالیں بتائیں۔ حکماء نے چیزوں کے خواص ظاہر کیے۔ طبیبوں نے بیماریوں کے نسخے ترتیب دیے۔ انجینئروں نے عمارتوں کا فن نکالا۔ کاریگروں نے ہنر اور فن پیدا کیے۔ ان سب کی کوششوں سے مل کر یہ دنیا تکمیل کو پہنچی۔ اس لیے ہم ان سب کے شکر گزار ہیں، مگر سب سے زیادہ ممنون ہم ان بزرگوں کے ہیں جنھوں نے اندرونی دنیا کو آباد کیا۔ جنھوں نے ہماری حرص و ہوا کی اندرونی چالیں درست کیں اور ہماری روحانی بیماریوں کے نسخے ترتیب دیے۔ ہمارے جذبات و احساسات اور ہمارے ارادوں کے نقشے درست کیے۔ ہمارے دل و دماغ کے عروج و زوال کا فن ترتیب دیا جس سے دنیا کے صحیح تمدن اور صحیح معاشرت کی تکمیل

ہوئی۔ اخلاق و سیرت انسانیت کا جوہر قرار پایا۔ نیکی اور بھلائی ایوان عمل کے نقش و نگار ٹھہرے۔ اللہ اور بندے کا رشتہ باہم مضبوط ہوا اور روزِ اَلَسْتُ کا بھولا ہوا وعدہ ہم کو یاد آیا۔ اگر ہم انسانی سرشت کے ان رموز و اسرار اور نیکی و سعادت کی ان پیغمبرانہ تعلیمات سے بالکل ناواقف ہوتے تو کیا یہ دنیا کبھی تکمیل کو پہنچ سکتی؟ اس لیے ان برگزیدہ اور پاک طبقۂ انسانی کے احسانات اور عنایات ہم سب انسانوں پر سب سے زیادہ ہیں۔ اس لیے ہر فردِ انسانی پر، خواہ وہ کسی صنف سے تعلق رکھتا ہو، ان کی شکرگزاری کا اظہار واجب ہے۔ اسی کا نام اسلام کی زبان میں صلاۃ و سلام ہے جو ہمیشہ انبیائے کرام علیہم السلام کے نامِ نامی کے ساتھ ساتھ ہم ادا کرتے ہیں: اَللّٰھُمَّ صَلِّ عَلَيْهِمْ وَسَلِّمْ.

حضرات! یہ نیک ہستیاں اپنے اپنے وقت پر آئیں اور گزر گئیں۔ اس عالم فانی کی کوئی چیز ابدی نہیں۔ ان کی زندگیاں خواہ کتنی ہی مقدس اور معصوم ہوں تاہم وہ دوام و بقا کی دولت سے سرفراز نہ تھیں۔ اس لیے آیندہ آنے والے انسانوں کے لیے جو چیز رہبر ہوسکتی ہے، وہ ان کی زندگیوں کے عملی نمونے اور تجربات ہیں۔ ہمارے پاس اس کے سوا اس سرمایۂ سعادت کی حفاظت کا کوئی اور طریقہ نہیں۔ دنیا میں پچھلے عہد کے علوم وفنون، خیالات، تحقیقات اور واقعات و حالات جاننے کا اس کے علاوہ کوئی ذریعہ نہیں ہے۔ انسانی زندگیوں کے انھی تحریری اور عملی نمونوں کا نام تاریخ اور سیرت ہے۔ ہماری زندگیوں کے دوسرے پہلوؤں میں ممکن ہے کہ ہر سانحۂ زندگی میں کوئی نہ کوئی عبرت و بصیرت ہو لیکن ہماری اخلاقی اور روحانی زندگی کی تکمیل و تزکیہ کے لیے صرف انبیائے کرام علیہم السلام اور ان کے نقش قدم پر چلنے والی ہستیوں کی تاریخیں اور سیرتیں ہی کار آمد

اور مفید ہو سکتی ہیں۔ اب تک دنیا نے انھی سے فیض پایا ہے اور آیندہ بھی انھی سے فیض پا سکتی ہے۔ اس لیے دنیا کا اپنے تزکیہ اور تکمیل روحانی کے لیے ان برگزیدہ ہستیوں کی سیرتوں کی حفاظت سب سے بڑا اور اہم فرض ہے۔

بہتر سے بہتر فلسفہ، عمدہ سے عمدہ تعلیم، اچھی سے اچھی ہدایت انسانی زندگی نہیں پا سکتی اور ہرگز کامیاب نہیں ہو سکتی، اگر اس کے پیچھے کوئی ایسی شخصیت اس کی حامل اور عامل نہ ہو جو ہماری توجہ، محنت اور عظمت کا مرکز ہو۔ جس جہاز سے ہم اوائل فروری 1924ء میں حجاز و مصر سے واپس آ رہے تھے، اتفاق سے مشہور شاعر ڈاکٹر ٹیگور بھی اسی پر امریکہ کے سفر سے واپس ہو رہے تھے۔ ایک رفیق سفر نے ان سے سوال کیا کہ برہمو سماج کی ناکامی کا سبب کیا ہے؟ حالانکہ اس کے اصول بہت منصفانہ، صلح کل کے تھے؟ اس کی تعلیم تھی کہ سارے مذہب سچے اور کل مذہبوں کے بانی اچھے اور نیک لوگ تھے۔ اس میں عقل اور منطق کے خلاف کوئی چیز نہ تھی۔ وہ موجودہ تمدن، موجودہ فلسفے اور موجودہ حالات کو دیکھ کر بنایا گیا تھا۔ تاہم اس نے کامیابی حاصل نہ کی۔ فلسفی شاعر نے جواب میں کتنا اچھا نکتہ بیان کیا کہ یہ اس لیے ناکام ہوا کہ اس کے پیچھے کوئی شخصی زندگی اور عملی سیرت نہ تھی جو ہماری توجہ کا مرکز بنتی اور ہماری نیکوکاری کا نمونہ بنتی۔ اس نکتے سے ثابت ہوتا ہے کہ مذہب اپنے نبی کی سیرت اور عملی زندگی کے بغیر ناکام ہے۔ غرض ہم کو اپنی ہدایت اور رہنمائی کے لیے ہر حیثیت سے باکمال بزرگوں کی ضرورت ہے اور وہ صرف انبیائے کرام علیہم السلام ہیں۔

سیرت نبوی ﷺ اور عالمگیر نمونہ

آج ہماری بزم کا دوسرا دن ہے۔ اس سے پہلے جو کچھ عرض ہو چکا ہے، وہ پیش نظر رہے تو سلسلۂ سخن آگے بڑھے۔ میری پچھلی تقریر کا خلاصہ یہ تھا کہ انسان کے حال اور مستقبل کی تاریکی کو چاک کرنے کے لیے ماضی کی روشنی سے فیض حاصل کرنا ضروری ہے۔ جن مختلف انسانی طبقوں نے ہم پر احسان کیے ہیں، وہ سب شکریے کے مستحق ہیں لیکن سب سے زیادہ ہم پر جن بزرگوں کا احسان ہے، وہ انبیائے کرام علیہم السلام ہیں۔ ان میں سے ہر ایک نے اپنے اپنے وقت میں، اپنی اپنی قوم کے سامنے اس زمانے کے مناسب حال، اخلاقِ عالیہ اور صفاتِ کاملہ کا ایک نہ ایک بلند ترین معجزانہ نمونہ پیش کیا۔ کسی نے صبر اور کسی نے ایثار، کسی نے قربانی، کسی نے جوشِ توحید، کسی نے ولولۂ حق، کسی نے تسلیم، کسی نے عفت، کسی نے زہد، غرضیکہ ہر ایک نے دنیا میں انسان کی پُر پیچ زندگی کے راستے میں ایک ایک مینار قائم کیا ہے جس سے صراط مستقیم کا پتہ لگ سکے۔ مگر ضرورت تھی ایک ایسے رہنما اور رہبر کی جو اس سرے سے لے کر اس سرے تک پوری راہ کو اپنی ہدایات اور عملی مثالوں سے روشن کر دے۔ گویا ہمارے ہاتھ میں اپنی عملی زندگی کی پوری رہنما کتاب دے دے جس کو لے کر اسی کی تعلیم و ہدایت کے

مطابق ہر مسافر بے خطر منزلِ مقصود کا پتہ پالے۔ یہ رہنما سلسلہ انبیائے کرام علیہم السلام کے آخری فرد حضرت محمد مصطفیٰ احمد مجتبیٰ ﷺ ہیں۔قرآن مجید کہتا ہے:

﴿ يَاأَيُّهَا النَّبِيُّ إِنَّا أَرْسَلْنَاكَ شَاهِدًا وَمُبَشِّرًا وَنَذِيرًا ۝ وَدَاعِيًا إِلَى اللَّهِ بِإِذْنِهِ وَسِرَاجًا مُنِيرًا ۝﴾

''اے پیغمبر! ہم نے تم کو گواہی دینے والا اور (نیکوں کو) خوشخبری دینے والا اور (غافلوں کو) خبردار کرنے والا اور اللہ کی طرف اس کے حکم سے پکارنے والا اور ایک روشن چراغ بنا کر بھیجا ہے۔''[1]

نبی ﷺ عالم میں اللہ کی تعلیم و ہدایت کے شاہد ہیں۔نیکوں کو فلاح اور سعادت کی بشارت سنانے والے مبشر ہیں۔ان کو جو ابھی تک بے خبر ہیں،خبردار کرنے والے اور بیدار کرنے والے نذیر ہیں۔بھٹکنے والے مسافروں کو اللہ کی طرف پکارنے والے داعی ہیں اور خود ہمہ تن نور اور چراغ ہیں، یعنی آپ ﷺ کی ذات اورآپ ﷺ کی زندگی راستے کی روشنی ہے جو راہ کی تاریکیوں کو دور کررہی ہے۔یوں تو ہر پیغمبر اس دنیا میں اللہ کا شاہد، داعی، مبشر اور نذیر بن کر آیا ہے،مگر یہ کل صفتیں سب کی زندگیوں میں عملاً یکساں نمایاں ہوکر ظاہر نہیں ہوئیں۔ بہت سے انبیاء علیہم السلام تھے جو خصوصیت کے ساتھ شاہد ہوئے، جیسے حضرت یعقوب علیہ السلام، حضرت اسحاق علیہ السلام اور حضرت اسماعیل علیہ السلام۔ بہت سے تھے جو نمایاں طور پر مبشر بنے، جیسے حضرت ابراہیم علیہ السلام حضرت عیسیٰ علیہ السلام۔ بہت سے تھے جن کا خاص وصف نذیر تھا، جیسے حضرت نوح علیہ السلام، حضرت موسیٰ علیہ السلام، حضرت ہود علیہ السلام اور حضرت شعیب علیہ السلام۔ بہت سے تھے جو امتیازی حیثیت سے داعیِ حق

[1] الأحزاب 33:45،46.

تھے، جیسے حضرت یوسف علیہ السلام اور حضرت یونس علیہ السلام۔ لیکن جو شاہد، مبشر، نذیر، داعی اور سراجِ منیر سب کچھ بیک وقت تھا اور جس کے مرقعِ حیات میں یہ سارے نقش ونگار عملاً نمایاں تھے، وہ صرف حضرت محمد رسول اللہ ﷺ تھے۔ یہ اس لیے ہوا کہ آپ ﷺ دنیا کے آخری پیغمبر بنا کر بھیجے گئے جس کے بعد کوئی دوسرا آنے والا نہ تھا۔ آپ ﷺ ایسی شریعت دے کر بھیجے گئے جو کامل تھی اور جس کی تکمیل کے لیے پھر کسی دوسرے کو آنا نہ تھا۔ نبی ﷺ کی تعلیم دائمی وجود رکھنے والی تھی، یعنی قیامت تک اس کو زندہ رہنا تھا۔ اس لیے آپ ﷺ کی ذات پاک کو مجموعۂ کمال اور دولت بے زوال بنا کر بھیجا گیا۔

یہ جو کچھ میں نے کہا، یہ میرے مذہبی عقیدے کی بنیاد پر محض کوئی دعویٰ نہیں ہے بلکہ یہ وہ واقعہ ہے جس کی بنیاد دلائل اور شہادتوں پر قائم ہے۔

وہ سیرت یا نمونۂ حیات جو انسانوں کے لیے ایک آئیڈیل سیرت کا کام دے اس کے لیے متعدد شرطوں کی ضرورت ہے جن میں سب سے پہلی اور اہم شرط تاریخ ہے۔

تاریخ سے مقصود یہ ہے کہ ایک کامل انسان کے جو سوانح اور حالات پیش کیے جائیں وہ تاریخ اور روایت کے لحاظ سے مستند ہوں۔ ان کی حیثیت قصوں اور کہانیوں کی نہ ہو۔ روز مرہ کا تجربہ ہے کہ انسان کی ایک نفسیاتی کیفیت یہ ہے کہ کسی سلسلۂ حیات کے متعلق اگر یہ معلوم ہو جائے کہ یہ فرضی اور خیالی ہے یا مشتبہ ہے تو خواہ وہ کسی مؤثر انداز ہی میں کیوں نہ پیش کیا جائے، طبیعتیں اس سے دیرپا اور گہرا اثر نہیں لیتیں۔ اس لیے ایک کامل سیرت کے لیے ضروری ہے کہ پہلے اس کے تمام اہم اجزاء کی تاریخ پر یقین ہو۔ یہی سبب ہے کہ تاریخی افسانوں سے جو اثر طبیعتوں میں پیدا ہوتا ہے، وہ خیالی افسانوں سے نہیں ہوتا۔

دوسرا سبب تاریخی سیرت کے ضروری ہونے کا یہ ہے کہ آپ اس سیرتِ کاملہ کا نقشہ محض دلچسپی یا فرصت کے گھنٹوں کے لیے نہیں پیش کرتے بلکہ اس غرض سے پیش کرتے ہیں کہ ہم اپنی زندگی اس نمونے پر ڈھالیں اور اس کی پیروی اور تقلید کریں۔ لیکن وہ زندگی اگر تاریخی اور واقعی طور سے ثابت نہیں تو آپ کیونکر اس کے قابل عمل اور پیروی وتقلید کے لائق ہونے پر زور دے سکتے ہیں۔ کہا جا سکتا ہے کہ یہ فرضی قصے ہیں جن پر کوئی انسان اپنی عملی زندگی کی بنیاد نہیں ڈال سکتا۔ اس لیے کیا پُر اثر ہونے کے لیے اور کیا قابل عمل اور لائق تقلید ہونے کے لیے سب سے پہلے ضروری یہ ہے کہ اس کامل انسان کی سیرت تاریخی اسناد کے معیار پر پوری اترے۔

ہم تمام انبیائے کرام علیہم السلام کا ادب اور احترام کرتے ہیں اور ان کے سچے پیغمبر ہونے پر یقین رکھتے ہیں لیکن

﴿تِلْكَ الرُّسُلُ فَضَّلْنَا بَعْضَهُمْ عَلٰى بَعْضٍ﴾

”یہ رسول ہیں جن میں سے بعض کو بعض پر ہم نے فضیلت دی ہے۔“[1]

دوام، بقا، ختمِ نبوت اور آخری کامل انسانی سیرت ہونے کی حیثیت سے محمد رسول اللہ ﷺ کو جو خاص شرف عطا ہوا ہے، وہ دیگر انبیاء کو اس لیے مرحمت نہ ہوا کہ ان کو دائمی، آخری اور خاتم النبوت نہیں بنایا گیا تھا۔ ان کی سیرتوں کا مقصد ایک خاص قوم کو ایک خاص زمانے تک نمونہ دینا تھا، اس لیے اس زمانے کے بعد وہ بتدریج دنیا سے ختم ہو گئیں۔

غور کرو کہ ہر ملک میں، ہر قوم میں، ہر زمانے میں اور ہر زبان میں کتنے لاکھ انسان

[1] البقرة2:253.

اللہ کا پیغام لے کر آئے ہوں گے۔ ایک اسلامی روایت کے مطابق ایک لاکھ چوبیس ہزار پیغمبر آئے، مگر آج ان میں سے کتنوں کے نام ہم جانتے ہیں اور جتنوں کے نام جانتے ہیں، ان کا حال کیا جانتے ہیں؟ دنیا کی تمام قوموں میں سب سے زیادہ قدیم اور پرانا ہونے کا دعویٰ ہندوؤں کو ہے۔ گو وہ مسلم نہیں لیکن بغور دیکھو کہ ان کے مذہب میں سیکڑوں شخصیات کے نام ہیں مگر ان میں سے کسی کو ''تاریخی'' ہونے کی عزت حاصل نہیں ہے۔ ان میں سے بہتوں کے تو نام کے سوا اور کسی چیز کا ذکر تک نہیں اور تاریخ کے میدان میں ان کا گزر بھی نہیں۔ ان میں بہتر سے بہتر معلوم شخصیات وہ ہیں جو مہا بھارت اور رامائن کے ہیرو ہیں، مگر ان کی زندگی کے واقعات میں سے تاریخ کس کو کہہ سکتے ہیں؟ یہ بھی نہیں معلوم کہ یہ زمانے کے کس دور کی کس صدی اور صدی کے کس سال کے واقعے ہیں؟

اب یورپ کے بعض علماء بیسیوں قیاسات سے کچھ کچھ تقریبی یا تخمینی زمانوں کی تعیین کرتے ہیں اور انھی کو ہمارے ہندو تعلیم یافتہ اصحاب اپنے علم کی سند جانتے ہیں۔ لیکن یورپ کے محققین میں سے زیادہ تر ان کو تاریخ کا درجہ نہیں دیتے اور یہ تسلیم نہیں کرتے کہ یہ فرضی داستانیں کبھی عالم وجود میں بھی آئی تھیں۔

ایران کے پرانے مجوسی مذہب کا بانی زرتشت اب بھی لاکھوں آدمیوں کی عقیدت کا مرکز ہے، مگر اس کی تاریخی شخصیت بھی قدامت کے پردے میں گم ہے۔ یہاں تک کہ اس کے تاریخی وجود کے متعلق بھی بعض شکی مزاج امریکن اور یورپین علماء کو شبہ ہے۔ مستشرقین میں سے جو لوگ اس کے تاریخی وجود کو تسلیم کرتے ہیں، سیکڑوں قیاسات سے اس کے حالات زندگی کی کچھ کچھ تعیین کرتے ہیں۔ تاہم وہ بھی مختلف محققین کی باہمی

متضاد آراء سے اس قدر مشکوک ہیں کہ کوئی انسان ان کے بھروسے پر اپنی عملی زندگی کی بنیاد نہیں قائم کرسکتا۔ زرتشت کی جائے پیدائش، سال پیدائش، قومیت، خاندان، مذہب، تبلیغ مذہب، مذہبی صحیفے کی اصلیت، زبان، سالِ وفات اور جائے وفات، ان میں سے ہر ایک مسئلے پر سیکڑوں اختلافات ہیں اور صحیح روایتوں کا اس قدر فقدان ہے کہ سوائے قیاسات کے اور کوئی روشنی ان سوالات کی تاریکیوں کو دور نہیں کرسکتی۔ البتہ پارسی اصحاب ان مشکوک قیاسی باتوں کا علم براہِ راست اپنی روایتوں سے نہیں رکھتے بلکہ یورپین اور امریکن اسکالرز کے ذریعے سے وہ ابھی سمجھنے کی کوشش کررہے ہیں اور جواُن کے ذاتی ذرائع علم ہیں، وہ ''فردوسی'' کے ''شاہنامہ'' سے آگے نہیں بڑھتے۔ یہ عذر بے کار ہے کہ یونانی دشمنوں نے ان کو مٹا دیا۔ یہاں بہرحال ہم کو اتنا ہی بتانا ہے کہ وہ مٹ گئے، خواہ وہ کسی طرح سے مٹے ہوں اور یہی اس بات کی دلیل ہے کہ ان کو دوام اور بقاء کی زندگی نہ ملی اور کرن (KERN) اور ڈارمیٹیٹر (DARMETETER) جیسے محققین کو زرتشت کی تاریخی شخصیت سے انکار کرنا پڑا۔

قدیم ایشیا کا سب سے زیادہ وسیع مذہب بودھ (بدھ مت) ہے جو کبھی ہندوستان، چین اور تمام ایشیائے وسطیٰ، افغانستان اور ترکستان تک پھیلا ہوا تھا اور اب بھی برما، سیام، چین، جاپان اور تبت میں موجود ہے۔ ہندوستان میں تو یہ کہنا آسان ہے کہ برہمنوں نے اس کو مٹا دیا اور ایشیائے وسطیٰ میں اس کا خاتمہ کردیا مگر تمام ایشیائے اقصیٰ میں تو اس کی حکومت، اس کی تہذیب، اس کا مذہب قائم ہے اور اس وقت سے اب تک غیر مفتوح ہے لیکن کیا یہ چیزیں بودھ کی زندگی اور سیرت کو تاریخی روشنی میں برقرار رکھ سکیں؟ اور ایک مؤرخ یا سوانح نگار کے تمام سوالات کا وہ تشفی بخش جواب

دے سکتی ہیں؟ خود بودھ کے زمانۂ وجود کی تعیین مگدھ دیس کے راجاؤں کے واقعات سے کی جاتی ہے۔ ورنہ کوئی دوسرا ذریعہ نہیں ہے اور ان راجاؤں کا زمانہ بھی اس طرح متعین ہوسکا ہے کہ ان کے سفارتی تعلقات اتفاقاً یونانیوں سے قائم ہو گئے تھے۔ چینی مذہب کے بانی کا حال اس سے بھی زیادہ غیر یقینی ہے اور چین کے ایک بانیِ مذہب کنفیوشس کی نسبت ہم کو بودھ سے بھی کم واقفیت ہے، حالانکہ اس کے ماننے والوں کی تعداد کروڑوں سے بھی زیادہ ہے۔

سامی قوم میں سیکڑوں پیغمبر آئے لیکن نام کے سوا تاریخ نے ان کا اور کچھ حال نہ جانا۔ حضرت نوح، حضرت ابراہیم، حضرت ہود، حضرت صالح، حضرت اسماعیل، حضرت اسحاق، حضرت یعقوب، حضرت زکریا اور حضرت یحییٰ علیہم السلام کے حالات اور سیرتوں کے ایک ایک حصے کے علاوہ کیا ہم کو کوئی کچھ بتا سکتا ہے؟ ان کی سیرتوں کے ضروری اجزاء تاریخ کی کڑیوں سے بہرحال گم ہیں۔ اب ان کی مقدس زندگیوں کے ادھورے اور نامربوط حصے کیا ایک کامل انسانی زندگی کی تقلید اور پیروی کا سامان کر سکتے ہیں؟ قرآن مجید کو چھوڑ کر یہودیوں کے جن اسفار میں ان کے حالات درج ہیں، ان میں سے ہر ایک کی نسبت محققین کو مختلف شکوک ہیں اور اگر ان شکوک سے ہم قطع نظر بھی کرلیں تو ان کے اندر ان بزرگوں کی تصویریں کس درجہ ادھوری ہیں۔

حضرت موسیٰ علیہ السلام کا حال ہم کو تورات سے معلوم ہوتا ہے مگر خود وہ تورات جو آج موجود ہے اہل تحقیق کے بیان کے مطابق جیسا کہ خود ہی مصنفین انسائیکلو پیڈیا آف برٹانیکا ✿

✿ انسائیکلو پیڈیا آف برٹانیکا: انسانی دنیا کے متعلق معلومات کا خزانہ، دنیا کا مشہور ترین انسائیکلو پیڈیا ہے۔ اس کی موجودہ اشاعت 24 ضخیم جلدوں پر مشتمل ہے جس کے مضامین کی تعداد دو لاکھ سے ◄◄

(Encyclopedia of Britanica) تسلیم کرتے ہیں کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام کے صدہا سال کے بعد عالم وجود میں آئی ہے۔ اس پر بھی اب جرمن اسکالرز نے پتہ لگایا ہے کہ موجودہ تورات میں پہلو بہ پہلو ہر واقعے کے متعلق دو مختلف صورتوں یا روایتوں کا سلسلہ ہے جو باہم کہیں کہیں متضاد ہے اور یہی سبب ہے کہ تورات کے سوانح وواقعات میں ہر قدم پر ہم کو تضاد بیان سے سابقہ پڑتا ہے۔ اس تھیوری کی تفصیل ''انسائیکلوپیڈیا آف برٹانیکا'' کے آخری ایڈیشن کے آرٹیکل ''بائبل'' میں موجود ہے۔ اب ایسی صورت میں موسیٰ علیہ السلام سے بلکہ آدم علیہ السلام سے لے کر حضرت موسیٰ علیہ السلام تک کے واقعات کی تاریخی حیثیت کیا رہ جاتی ہے؟

حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے حالات انجیلوں میں درج ہیں مگر ان بہت سی انجیلوں میں سے آج عیسائی دنیا کا بڑا حصہ چار انجیلوں کو مانتا ہے۔ باقی انجیلِ طفولیت اور انجیل برناباس وغیرہ غیر مستند ہیں۔ ان چار انجیلوں میں سے ایک انجیل کے لکھنے والے نے بھی حضرت عیسیٰ علیہ السلام کو خود نہیں دیکھا تھا۔ انھوں نے کس سے سن کر یہ حالات کا مجموعہ لکھا؟ یہ بھی معلوم نہیں، بلکہ اب تو یہ اور بھی مشکوک سمجھا جاتا ہے کہ جن چار آدمیوں کی طرف ان کی نسبت کی جاتی ہے، وہ نسبت صحیح بھی ہے؟ یہ بھی واضح طور پر ثابت نہیں کہ وہ کن زبانوں میں اور کن زمانوں میں لکھی گئیں۔ 60ء سے لے کر بعد کے متعدد مختلف سالوں تک مختلف مفسرینِ اناجیل ان کی تصنیف کا زمانہ بتاتے ہیں۔

حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی پیدائش، وفات اور تثلیث کی تعلیم، ان سب کو سامنے رکھ کر

◄◄ زیادہ ہے۔ اس انسائیکلوپیڈیا کا پہلا ایڈیشن 1768ء میں شائع ہوا جو اسکارٹ لینڈ کے تین سکالرز کی محنت کا ثمر تھا۔ مکمل انسائیکلوپیڈیا کمپیوٹر سی ڈی پر منتقل ہو چکا ہے اور معمولی قیمت پر دستیاب ہے۔

اب بعض امریکن نقاد اور ریشنلسٹ یہ کہنے لگے ہیں کہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کا وجود محض فرضی ہے اوران کی پیدائش اور تثلیث کا بیان محض افسانہ ہے کیونکہ اس قسم کے خیالات ان قوموں میں مختلف دیوتاؤں اور ہیروؤں کے متعلق پہلے سے موجود تھے، چنانچہ شکاگو کے مشہور رسالے ''روپن کورٹ'' میں مہینوں حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے فرضی وجود پر بحث رہی ہے۔ اس بیان سے عیسائی روایتوں کے ذریعے سے حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی زندگی کی تاریخی حیثیت کتنی کمزور معلوم ہوتی ہے۔

کسی انسانی سیرت کے دائمی نمونۂ عمل بننے کے لیے یہ بھی ضروری ہے کہ اس کی زندگی کے تمام حصے ہماری نگاہوں کے سامنے ہوں، کوئی واقعہ پردۂ راز اور ناواقفیت کی تاریکی میں گم نہ ہو، بلکہ اس کے تمام سوانح اور حالات روز روشن کی طرح دنیا کے سامنے ہوں تا کہ یہ معلوم ہو سکے کہ اس کی سیرت کہاں تک انسانی سوسائٹی کے لیے ایک آئیڈیل زندگی کی صلاحیت رکھتی ہے۔

اس معیار پر اگر بانیانِ مذاہب کے سوانح اور سیرتوں پر نظر ڈالو تو معلوم ہوگا کہ محمد رسول اللہ ﷺ کے سوا اور کوئی ہستی اس معیار پر پوری نہیں اترتی۔اسی سے معلوم ہوا کہ آپ ﷺ خاتم الانبیاء ہوکر دنیا میں تشریف لائے تھے۔

ہم کہہ چکے ہیں کہ ہزاروں، لاکھوں انبیاء علیہم السلام اور مصلحینِ دین کے زمرے میں سے صرف تین چار ہستیاں ایسی ہیں جو تاریخی کہی جاسکتی ہیں۔لیکن کاملیت کے لحاظ سے وہ بھی پوری نہیں ہیں۔غور کرو کہ مردم شماری کے لحاظ سے آج بودھ کے پیرو دنیا میں آبادی کے چوتھائی حصہ پر قابض ہیں۔ مگر تاریخی حیثیت سے بودھ کی زندگی صرف چند قصوں اور کہانیوں کا مجموعہ ہے۔لیکن اگر ہم انھی کہانیوں اور قصوں کو تاریخ

کا درجہ دے کر بودھ کی زندگی کے ضروری سے ضروری اور اہم سے اہم اجزاء تلاش کریں تو ہم کو ناکامی ہوگی۔ ان قصوں اور کہانیوں سے ہم کو زیادہ سے زیادہ یہ معلوم ہوتا ہے کہ کسی زمانے میں نیپال کی ترائی کے کسی ملک میں راجہ کا ایک لڑکا تھا جس نے فطرتاً سوچنے والی طبیعت پائی تھی۔ جوان ہونے پر اور ایک بچے کا باپ بننے کے بعد اتفاقاً اس کی نظر چند مصیبت زدہ انسانوں پر پڑی۔ اس کی طبیعت بے حد متاثر ہوئی اور وہ گھر بار چھوڑ کر دیس سے نکل گیا اور بنارس گیا۔ پاٹلی پتر (پٹنہ) اور راجگیر (بہار) کے شہروں میں اور کبھی جنگلوں اور پہاڑوں میں پھرتا رہا اور اللہ جانے عمر کی کتنی منزلیں طے کرنے کے بعد اس نے ''گیا'' کے ایک درخت کے نیچے انکشافِ حقیقت کا دعویٰ کیا اور بنارس سے بہار تک اپنے نئے مذہب کا وعظ کہتا رہا۔ پھر اس دنیا سے رخصت ہوگیا۔ یہ بودھ کے متعلق ہماری معلومات کا خلاصہ ہے۔

زرتشت بھی ایک مذہب کا بانی ہے، مگر ہم بتا چکے ہیں کہ قیاسات کے سوا اس کی زندگی اور سیرت کا بھی سراغ نہیں ملتا۔ ان قیاسات سے بھی جو کچھ معلوم ہوا ہے، اس کو ہم بجائے اپنی زبان سے کہنے کے بیسوی صدی کے مستند خلاصۂ معلومات انسائیکلو پیڈیا آف برٹانیکا سے یہاں نقل کرتے ہیں:

''زرتشت کی جس شخصیت سے (گاتھا کے) ان اشعار میں ہماری ملاقات ہوتی ہے، وہ نئے اوستا کے زرتشت سے بالکل مختلف ہے۔ وہ ٹھیک متضاد ہے، اس دوسرے افسانے کی معجزانہ شخصیت سے (اس کے بعد گاتھا کے کچھ واقعی حالات نقل کر کے مضمون نگار لکھتا ہے:) البتہ ہم یہ توقع نہ کریں کہ ہم گاتھا سے زرتشت کے فیصلہ کن حالات جان سکتے ہیں۔ وہ ہم کو زرتشت کی زندگی کا

کوئی تاریخی بیان نہیں دیتی اور جو کچھ بھی ملتا ہے اس کے معنی یا تو صاف نہیں ہیں یا غیر مفہوم ہیں۔''[1]

زرتشت کے متعلق موجودہ زمانے کی تصنیفات کا باب شروع کرتے ہوئے مضمون نگار لکھتا ہے:

''اس کی جائے پیدائش کی تعیین کے متعلق شہادتیں متضاد ہیں۔''

اس کے زمانے کے تعین کے متعلق بھی یونانی مؤرخین کے بیانات، نیز موجودہ محققین کے قیاسات مختلف ہیں۔ مضمون نگار لکھتا ہے:

''زرتشت کے زمانے سے ہم قطعاً ناواقف ہیں۔''

بہرحال جو کچھ ہم کو معلوم ہوا ہے، وہ یہ ہے کہ زرتشت آذربائیجان کے کسی مقام میں پیدا ہوا۔ بلخ وغیرہ کی طرف تبلیغ کی۔ ہشتاسپ بادشاہ نے اس کے مذہب کو اختیار کیا۔ کچھ اس نے غیر معمولی معجزے دکھائے، اس نے شادی بیاہ کیا۔ اولادیں ہوئیں اور پھر کہیں مر گیا۔ کیا ایسی نامعلوم ہستی کے متعلق کوئی کاملیت کا گمان بھی کر سکتا ہے اور اس کی زندگی انسانی سوسائٹی کے لیے چراغِ راہ بن سکتی ہے یا بنائی جا سکتی ہے؟

انبیائے سابقین میں سے سب سے مشہور زندگی حضرت موسیٰ علیہ السلام کی ہے۔ موجودہ تورات کے مستند یا غیر مستند ہونے کی بحث سے قطع نظر کر کے ہم اس کے بیانات کو بالکل مستند تسلیم کر لیتے ہیں۔ تاہم تورات کی پانچوں کتابوں سے ہم کو حضرت موسیٰ علیہ السلام کی زندگی کے کس قدر اجزاء ہاتھ آتے ہیں؟ جو کچھ ہے وہ یہ ہے کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام پیدا ہو کر فرعون کے گھر پرورش پاتے ہیں اور جوان ہو کر فرعونیوں کے مظالم

[1] انسائیکلوپیڈیا آف برٹانیکا (گیارھواں ایڈیشن)

کے خلاف بنی اسرائیل کی ایک دو موقعوں پر مدد کرتے ہیں، پھر مصر سے بھاگ کر مدین آتے ہیں۔ یہاں شادی ہوتی ہے اور خاصی مدت یہاں زندگی بسر کر کے مصر واپس جاتے ہیں۔ راہ نبوت سے سرفراز ہوتے ہیں۔ فرعون کے پاس پہنچتے ہیں، معجزات دکھاتے ہیں اور بنی اسرائیل کو مصر سے لے جانے کی رخصت چاہتے ہیں۔ رخصت نہیں ملتی، بالآخر اپنی قوم کے ساتھ نکل جاتے ہیں۔ اللہ کے حکم سے سمندر میں ان کو راہ مل جاتی ہے۔ فرعون غرق ہوجاتا ہے اور موسیٰ علیہ السلام اپنی قوم کو لے کر عرب اور شام کو چلے جاتے ہیں۔ کافر باشندوں سے لڑائیاں پیش آتی ہیں۔ اسی حالت میں جب وہ بہت بوڑھے ہوجاتے ہیں تو ایک پہاڑی پر ان کی وفات ہوجاتی ہے۔ تورات استثنا کے اختتامی فقرے میں لکھا ہے:

"سو خداوند کا بندہ موسیٰ علیہ السلام خداوند کے حکم کے موافق مواب کی سرزمین میں مرگیا اور اس نے اسے مواب کی وادی میں بیتِ فغور کے مقابل گاڑا، لیکن آج کے دن تک کوئی اس کی قبر کو نہیں جانتا اور موسیٰ علیہ السلام اپنے مرنے کے وقت ایک سو بیس برس کا تھا اور اب تک بنی اسرائیل میں موسیٰ علیہ السلام کی مانند کوئی نبی نہیں ہوا۔"

۞ یہ تورات کی پانچویں کتاب کے فقرے ہیں جس کی تصنیف بھی حضرت موسیٰ علیہ السلام کی طرف منسوب ہے۔ ان فقروں میں سب سے پہلے آپ کی نظر اس پر پڑنی چاہیے کہ یہ پوری کتاب یا اس کے آخری اجزاء حضرت موسیٰ علیہ السلام کی تصنیف نہیں، لیکن دنیا حضرت موسیٰ علیہ السلام کے اس سوانح نگار سے واقف نہیں۔

۞ ان درسوں کے الفاظ "آج تک اس کی قبر کو کوئی نہیں جانتا اور اب تک ویسا کوئی

نبی بنی اسرائیل میں نہیں ہوا'' ظاہر کرتے ہیں کہ سوانح موسوی علیہ السلام کے یہ تکمیلی اجزاء اتنی مدت دراز کے بعد لکھے گئے ہیں جس میں ایک مشہور یادگار کو لوگ بھول جا سکتے ہیں اور ایک نئے پیغمبر کی تشریف آوری کی توقع کی جا سکتی تھی۔

✿ حضرت موسیٰ علیہ السلام نے ایک سو بیس برس کی عمر پائی مگر غور سے دیکھو کہ اس ایک سو بیس برس کی عمر کے طویل زمانے کی وسعت کو بھرنے کے لیے ہم کو موسیٰ علیہ السلام کے کیا واقعات معلوم ہوئے ہیں؟ اور ان کے سوانح کے ضروری اجزاء ہمارے ہاتھ میں کیا ہیں؟ پیدائش، جوانی میں ہجرت، شادی اور نبوت کے واقعات معلوم ہیں، پھر چند لڑائیوں کے بعد بڑھاپے میں 120 برس کی عمر میں ان سے ملاقات ہوتی ہے۔ ان واقعات کو جانے دیجیے۔ یہ تو شخصی حالات ہیں جو ہر شخص کی زندگی میں الگ الگ پیش آتے ہیں۔ انسان کو اپنی سوسائٹی کے عملی نمونے کے لیے جن اجزاء کی ضرورت ہے، وہ اخلاق و عادات اور زندگانی کے طور طریق ہیں اور یہی اجزاء حضرت موسیٰ علیہ السلام کی پیغمبرانہ سوانح عمری سے گم ہیں۔ ورنہ عام جزوی حالات، یعنی اشخاص کے نام و نسب، مقامات کے پتے، مردم شماریاں اور قانونی قال و اقوال بہت کچھ تورات میں مذکور ہیں۔ مگر یہ معلومات، خواہ جغرافیہ، نسب ناموں اور قانون دانی کے لیے کسی قدر ضروری کیوں نہ ہوں مگر عملی حیثیت سے بالکل بے کار اور اجزائے سوانح کی کاملیت سے خالی ہیں۔

اسلام سے سب سے زیادہ قریب العہد پیغمبر حضرت عیسیٰ علیہ السلام ہیں جن کے پیرو آج یورپین مردم شماری کے مطابق تمام دوسرے مذاہب کے پیرووں سے زیادہ ہیں۔ مگر یہ سن کر آپ کو حیرت ہوگی کہ اس مذہب کے پیغمبر کی زندگی کے اجزاء تمام دوسرے مذاہب کے بانیوں اور پیغمبروں کے سوانح سے سب سے زیادہ کم معلوم ہیں۔ آج

عیسائی یورپ کے تاریخی ذوق کا یہ حال ہے کہ وہ بابل و اسیریا، عرب و شام، مصر و افریقہ، ہندوستان و ترکستان کے ہزارہا برس کے واقعات کتابوں اور کتبوں کو پڑھ کر کھنڈروں، پہاڑوں اور زمین کے طبقوں کو کھود کر منظر عام پر لا رہا ہے اور دنیا کی تاریخ کے گمشدہ اوراق از سرنو ترتیب دے رہا ہے۔ مگر اس کا مسیحائی معجزہ جس چیز کو زندہ نہیں کرسکتا وہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی زندگی کے مدفون واقعات ہی ہیں۔ پروفیسر رینان نے کیا کیا نہ کیا مگر حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے واقعاتِ زندگی نہ ملنا تھے نہ مل سکے۔ انجیل کے بیان کے مطابق حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی زندگی 33 برس کی تھی۔ موجودہ انجیلوں کی روایتیں اولاً تو نامعتبر ہیں اور جو کچھ ہیں بھی وہ صرف ان کے آخری تین سالوں کی زندگی پر مشتمل ہیں۔ ہم کو ان کی تاریخی زندگی کے صرف یہ حصے معلوم ہیں۔ وہ پیدا ہوئے اور پیدائش کے بعد مصر لائے گئے۔ لڑکپن میں دو معجزے دکھائے، اس کے بعد وہ غائب ہوجاتے ہیں اور پھر یک بیک تیس برس کی عمر میں بپتسمہ دیتے اور پہاڑوں اور دریاؤں کے کنارے ماہی گیروں کو وعظ کہتے نظر آتے ہیں۔ چند شاگرد پیدا ہوتے ہیں، یہودیوں سے چند مناظرے ہوتے ہیں اور یہودی ان کو پکڑوا دیتے ہیں۔ رومی گورنر کی عدالت میں مقدمہ پیش ہوتا ہے اور سولی دے دی جاتی ہے۔ تیسرے دن ان کی قبر ان کی لاش سے خالی نظر آتی ہے۔ تیس برس اور کم از کم 25 برس کا زمانہ کہاں گزرا، کیوں کر گزرا؟ دنیا اس سے ناواقف ہے اور رہے گی۔ ان تین آخری برسوں کے واقعات بھی کیا ہیں؟ چند معجزے اور مواعظ اور آخر سولی۔

کسی سیرت کے عملی نمونہ بننے کے لیے تیسری ضروری شرط جامعیت ہے۔ جامعیت سے مقصود یہ ہے کہ مختلف طبقاتِ انسانی کو اپنی ہدایت اور روشنی کے لیے جن

نمونوں کی ضرورت ہوتی ہے یا ہر فرد، ہر انسان کو اپنے مختلف تعلقات و روابط، فرائض اور واجبات کو ادا کرنے کے لیے جن نمونوں اور مثالوں کی حاجت ہوتی ہے، وہ سب اس ''آئیڈیل زندگی'' کے آئینے میں موجود ہوں۔ اس نقطۂ نگاہ سے بھی دیکھیے تو معلوم ہوگا کہ سوائے خاتم الانبیاء ﷺ کے کوئی دوسری شخصیت اس معیار پر پوری نہیں اترتی۔ مذہب کیا چیز ہے؟ اللہ اور بندوں اور باہم بندوں کے متعلق جو واجبات اور فرائض ہیں، ان کو تسلیم کرنا اور ادا کرنا۔ دوسرے لفظوں میں یہ کہا جاسکتا ہے کہ وہ حقوق اللہ اور حقوق العباد کا نام ہے۔ اس لیے ہر مذہب کے ماننے والوں کا فرض ہے کہ وہ اپنے اپنے بانیوں اور پیغمبروں کی سیرتوں میں ان حقوق، فرائض اور واجبات کی تفصیلات تلاش کریں اور ان کے مطابق اپنی زندگی کو اس قالب میں ڈالنے کی کوشش کریں۔ حقوق اللہ اور حقوق العباد دونوں حیثیتوں سے جب آپ تفصیلات ڈھونڈھیں گے تو وہ آپ کو پیغمبر اسلام ﷺ کے سوا کہیں نہیں ملیں گی۔

مذاہب دو قسم کے ہیں۔ ایک وہ جن میں اللہ کو تسلیم ہی نہیں کیا گیا ہے جیسا کہ بودھ اور جین مذہب کے متعلق کہا جاتا ہے۔ اس لیے ان مذہبوں میں تو اللہ، اس کی ذات و صفات اور دیگر حقوقِ الٰہی کا پتہ ہی نہیں اور اس لیے ان کے بانیوں میں محبت الٰہی، خلوص اور توحید پرستی کی تلاش ہی بے کار ہے۔ دوسرے وہ مذاہب ہیں جنھوں نے اللہ کو کسی نہ کسی رنگ میں مانا اور تسلیم کیا ہے۔ ان مذہبوں اور بانیوں کی زندگیوں میں بھی خدا طلبی کے واقعات مفقود ہیں۔ اللہ کے متعلق ہم کو کیا کیا اعتقاد رکھنے چاہئیں اور ان کے کیا اعتقادات تھے؟ اور ان اعتقادات پر ان کو عملاً کس حد تک یقین تھا؟ اس کی تفصیل سے ان کی سیرتیں خالی ہیں۔ پوری تورات پڑھ جاؤ، اللہ کی

توحید اور اس کے احکام اور قربانی کی شرائط کے علاوہ تورات کی پانچ کتابوں میں کوئی ایسا فقرہ نہیں جس سے یہ معلوم ہو کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام کے تعلقاتِ قلبی اور اطاعت وعبادت اور اللہ پر توکل ویقین، اللہ کی صفاتِ کاملہ کی جلوہ گری ان کے قلبِ اقدس میں کہاں تک تھی؟ حالانکہ اگر موسیٰ علیہ السلام کا مذہب ہمیشہ کے لیے اور آخری مذہب کے طور پر آیا ہوتا تو اس کے ماننے والوں کا فرض تھا کہ وہ ان واقعات کو قیدِ تحریر میں لاتے۔ مگر اللہ کی مصلحت یہ نہ تھی، اس لیے ان کو یہ توفیق ہی نہ ملی۔

حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی زندگی کا آئینہ انجیل ہے۔ انجیل میں اس ایک مسئلے کے علاوہ کہ اللہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کا باپ تھا، ہم کو یہ معلوم نہیں ہوتا کہ اس دنیاوی زندگی میں اس مقدس باپ اور بیٹے میں کیا تعلقات اور روابط تھے۔ بیٹے کے اقرار سے یہ تو معلوم ہوتا ہے کہ باپ کو بیٹے سے بڑی محبت تھی مگر یہ نہیں معلوم کہ بیٹے کو باپ سے کس درجہ محبت تھی؟ وہ کہاں تک اپنے باپ کی اطاعت اور فرماں برداری میں مصروف تھا۔ وہ اس کے آگے شب و روز میں کبھی جھکتا بھی تھا اور ''آج کی روٹی'' کے علاوہ کوئی اور چیز بھی اس نے اس سے کبھی مانگی؟ گرفتاری کی رات سے پہلے کوئی ایک رات بھی اس پر ایسی گزری کہ جب وہ اپنے باپ کے حضور میں دعا مانگ رہا ہو۔ پھر ایسی سیرت سے ہم روحانی حیثیت سے کیا فائدہ اٹھا سکتے ہیں؟ اگر حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی سیرت میں اللہ اور بندے کے تعلقات واضح ہوتے تو ساڑھے تین سو برس کے بعد پہلے عیسائی بادشاہ کو نیقیہ میں 300 عیسائی علماء کی مجلس اس کے فیصلہ کے لیے فراہم نہ کرنی پڑتی اور وہ اب تک ایک ناقابلِ فہم راز نہ بنے رہتے۔

اب حقوق العباد کی حیثیت کو لیجیے تو اس سے بھی حضرت خاتم النبیین ﷺ کے سوا

تمام دیگر انبیاء علیہم السلام اور بانیانِ مذاہب کی سیرتیں خالی ہیں۔ بودھ نے اپنے تمام اہل وعیال اور خاندان کو چھوڑ کر جنگل کا راستہ لیا اور پھر کبھی اپنی پیاری بیوی سے جس سے اس کو بے حد پیار و محبت تھی اور اپنے اکلوتے بیٹے سے کوئی تعلق نہ رکھا، دوستوں کے جھرمٹ سے علیحدہ ہوگیا۔ حکومت اور سلطنت کے بارِ گراں سے سبکدوشی حاصل کی اور نروان یا موت کے حصول کو انسانی زندگی کا آخری مقصد قرار دیا۔ ان حالات میں کوئی انسان یہ سمجھ سکتا ہے کہ اس دنیا کے بسنے والوں کے لیے جن میں حکومت اور رعایا، شاہ و گدا، آقا اور نوکر، باپ بیٹے، بھائی بہن اور دوست و احباب کے تعلقات ہیں، بودھ کی سیرت کچھ کارآمد ہوسکتی ہے؟ کیا بودھ کی زندگی میں کوئی ایسی جامعیت ہے جو تارک الدنیا بھکشوؤں اور کاروباری انسانوں دونوں کے لیے قابل تقلید ہو؟ اس لیے اس کی زندگی کبھی اس کے ماننے والے کاروباریوں کے لیے قابلِ تقلید نہ بنی، ورنہ چین، جاپان، سیام وانام، تبت و برما کی تمام سلطنتیں، تجارتیں اور دیگر کاروباری مشاغل فوراً بند ہوجاتے اور بجائے آباد شہروں کے صرف سنسان جنگلوں کا وجود رہ جاتا۔

حضرت موسیٰ علیہ السلام کی زندگی کا ایک پہلو ہی نہایت واضح ہے کہ وہ جنگ اور سپہ سالاری کا پہلو ہے۔ ورنہ اس کے علاوہ ان کی سیرت کی پیروی کرنے والوں کے لیے دنیاوی حقوق، واجبات، فرائض اور ذمہ داریوں کا کوئی نمونہ موجود نہیں ہے۔ میاں بیوی، باپ بیٹے، بھائی بھائی اور دوست و احباب کے متعلق ان کا کیا طرزِ عمل تھا؟ صلح کے فرائض میں ان کا کیا دستور تھا؟ اپنے مال و دولت کو کن مفید کاموں میں انھوں نے لگایا؟ بیماروں، یتیموں، مسافروں اور غریبوں کے ساتھ ان کا کیا برتاؤ تھا؟ اور ان کے ماننے والے ان امور میں ان کی زندگی کی مثالوں سے کیونکر فائدہ اٹھائیں؟

حضرت موسیٰ علیہ السلام بیوی رکھتے تھے، بچے رکھتے تھے، بھائی رکھتے تھے، دوسرے عزیز رشتے دار اور متعلقین رکھتے تھے اور ہمارا اعتقاد ہے کہ ان کا پیغمبرانہ طرزِ عمل یقیناً حرف گیری سے پاک ہوگا مگر ان کی موجودہ سیرت کی کتابوں میں ہم کو یہ ابواب نہیں ملتے جو ہمارے لیے قابلِ تقلید اور نمونہ ہوں۔

حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی ماں تھیں اور انجیل کے بیان کے مطابق ان کے بھائی بہن بھی تھے بلکہ مادی باپ تک بھی موجود تھا۔ مگر ان کی زندگی کے واقعات، ان عزیزوں اور رشتہ داروں کے ساتھ ان کا تعلق، طرزِ عمل، سلوک اور برتاؤ ظاہر نہیں کرتے، حالانکہ دنیا انھی تعلقات سے آباد رہی ہے اور رہے گی۔ مذہب کا بڑا حصہ انھی کی متعلقہ ذمہ داریوں کے ادا کرنے کا نام ہے۔ علاوہ ازیں حضرت عیسیٰ علیہ السلام نے محکومی کی زندگی بسر کی، اس لیے ان کی سیرت تمام حاکمانہ فرائض کی مثالوں سے خالی ہے۔ وہ شادی شدہ نہ تھے، اس لیے ان دو جوڑوں کے لیے جن کے درمیان تورات کے پہلے ہی باب نے ماں باپ سے زیادہ مضبوط رشتہ قائم کیا ہے، حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی زندگی تقلید کا کوئی سامان نہیں رکھتی اور دنیا کی بیشتر آبادی بیوی بچوں والی زندگی رکھتی ہے، اس لیے اس کے معنی یہ ہیں کہ دنیا کے بیشتر حصہ آبادی کے لیے ان کی سیرت نمونہ نہیں بن سکتی۔ جس نے گھر بار، اہل و عیال اور مال و دولت، صلح و جنگ، دوست و دشمن کے تعلقات سے کبھی واسطہ ہی نہ رکھا ہو، وہ اس دنیا کے لیے جو انھی تعلقات سے معمور ہے کیونکر مثال ہوسکتا ہے! اگر آج دنیا یہ اختیار کرلے تو کل وہ سنسان قبرستان بن جائے۔ تمام ترقیاں فی الفور رک جائیں اور عیسائی یورپ تو شاید ایک منٹ کے لیے زندہ بھی نہ رہے۔

''آئیڈیل لائف'' کا سب سے آخری معیارِ عمل ہے۔ اس سے یہ مقصود ہے کہ شارعِ دین اور بانیِ مذہب جب تعلیم کو پیش کررہا ہو تو خود اس کا ذاتی عمل اس کی مثال اور نمونہ ہو اور خود اس کے عمل نے اس کی تعلیم کو عمل کے قابل ثابت کیا ہو۔

خوش کن سے خوش کن فلسفہ، دلچسپ سے دلچسپ نظریہ اور خوش آیند سے خوش آیند اقوال ہر وقت ہر شخص پیش کرسکتا ہے، لیکن جو چیز ہر شخص ہر وقت پیش نہیں کرسکتا وہ عمل ہے۔ انسانی سیرت کے بہتر اور کامل ہونے کی دلیل، اس کے نیک اور معصوم اقوال، خیالات اور اخلاقی و فلسفیانہ نظریے نہیں بلکہ اس کے کارنامے اور اعمال ہیں۔ اگر یہ معیار قائم نہ کیا جائے تو اچھے اور برے کی تمیز اٹھ جائے اور دنیا صرف بات بنانے والوں کی جگہ رہ جائے۔ اب مجھے پوچھنے دیجیے کہ لاکھوں شارعین اور ہزاروں بانیانِ مذاہب میں سے کون اپنی عملی سیرت کو اس ترازو پر تلوانے کے لیے آگے بڑھ سکتا ہے؟

''تو اپنے خداوند کریم کو اپنی ساری جان اور دل سے پیار کر۔ تو دشمن کو پیار کر جو تیرے داہنے گال پر تھپڑ مارے تو اس کے سامنے اپنا بایاں گال بھی پھیر دے۔ جو تجھ کو ایک میل بے گار لے جائے تو اس کے ساتھ دو میل جا۔ جو تیرا کوٹ مانگے تو اس کو کرتہ بھی دے دے۔ تو اپنے مال و اسباب کو اللہ کی راہ میں دے دے۔ تو اپنے بھائی کو ستر دفعہ معاف کر، آسمان کی بادشاہت میں دولت مند کا داخل ہونا مشکل ہے۔''

یہ اور اسی قسم کی بہت سی نصیحتیں نہایت ہی دل خوش کن ہیں، مگر عمل سے ان کی تصدیق نہ ہو تو وہ سیرت کا ٹکڑا نہیں بلکہ وہ صرف معصومانہ شیریں زبانیوں کا ایک مجموعہ ہے۔ جس نے اپنے دشمن پر قابو نہ پایا ہو وہ عفوو درگزر کی عملی مثال کیسے پیش کرسکتا ہے؟ جس کے پاس خود کچھ نہ ہو وہ غریبوں، مسکینوں اور یتیموں کی مدد کیونکر کرسکتا

ہے؟ جو عزیز و اقارب، بیوی بچے نہ رکھتا ہو، وہ انھی تعلقات سے آباد دنیا کے لیے مثال کیونکر بن سکتا ہے؟ جس نے بیماروں کی تیمارداری اور عیادت نہ کی ہو وہ اس کا وعظ کیونکر کہہ سکتا ہے؟ جس کو خود دوسروں کو معاف کرنے کا موقع نہ ملا ہو، اس کی زندگی ہم میں سے غضب ناک اور غصہ ور لوگوں کے لیے نمونہ کیسے بنے گی؟

غور فرمائیے! نیکیاں دو قسم کی ہوتی ہیں، ایک سلبی، ایک ایجابی، مثلاً: آپ پہاڑ کے ایک کھوہ میں جا کر عمر بھر کے لیے بیٹھ گئے تو صرف یہ کہنا صحیح ہوگا کہ بدیوں اور برائیوں سے آپ نے پرہیز کیا، یعنی آپ نے کوئی کام ایسا نہ کیا جو آپ کے لیے قابلِ اعتراض ہو مگر یہ تو سلبی تعریف ہوئی، ایجابی پہلو آپ کا کیا ہے؟ کیا آپ نے غریبوں کی مدد کی، محتاجوں کو کھانا کھلایا، کمزوروں کی حمایت کی، ظالموں کے مقابلے میں حق گوئی سے کام لیا، گرتوں کو سنبھالا، گمراہوں کو راستہ دکھایا؟ عفو و کرم، سخاوت، مہمان نوازی، حق گوئی، رحم، حق کی نصرت کے لیے جوش، جدوجہد، مجاہدہ، ادائے فرض، ذمہ داریوں کی بجا آوری، غرض تمام وہ اخلاق جن کا تعلق عمل سے ہے، وہ صرف سلبِ فعل اور عدمِ عمل سے نیکیاں نہیں بن جائیں گی۔ نیکیاں صرف سلبی ہی پہلو نہیں رکھتیں، زیادہ تر ایجابی اور عملی پہلو پر ان کا مدار ہوتا ہے۔

اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ جس سیرت کا عملی حصہ سامنے نہ ہو اس کو ''آئیڈیل لائف'' اور قابلِ تقلید زندگی کا خطاب نہیں دیا جا سکتا کہ انسان اس کی کس چیز کی نقل کرے گا؟ اور کس عمل سے سبق حاصل کرے گا؟ ہم کو تو صلح و جنگ، فقر و دولت، شادی اور کنوارگی، تعلقاتِ رب کریم اور تعلقاتِ عباد، حاکمیت و محکومیت، سکون و بے اطمینانی، جلوت و خلوت غرض زندگی کے ہر پہلو کے متعلق عملی مثال چاہیے۔ دنیا کا بیشتر بلکہ

تمام تر حصہ انھی مشکلات اور تعلقات میں الجھا ہوا ہے، اس لیے لوگوں کو انھی مشکلات کے حل کرنے اور انھی تعلقات کو بوجہ احسن انجام دینے کے لیے عملی مثالوں کی ضرورت ہے۔ قولی نہیں بلکہ عملی، لیکن یہ کہنا شاعری نہیں اور خطابت نہیں بلکہ تاریخی واقعہ ہے کہ اس معیار پر بھی سیرتِ محمد ﷺ کے سوا کوئی دوسری سیرت پوری نہیں اتر سکتی۔

میں نے آج جو کچھ کہا ہے اس کو اچھی طرح سمجھ لیجیے۔ میں یہ کہنا اور دکھانا چاہتا ہوں کہ آئیڈیل لائف اور نمونۂ تقلید بننے کے لیے جو حیات انسانی منتخب کی جائے، ضروری ہے کہ اس کی اپنی سیرت کے موجودہ نقشہ میں یہ چار باتیں پائی جائیں، یعنی تاریخی لحاظ سے مکمل ہو، جامع ہو، کامل ہو اور عمل پر مبنی ہو۔ میرا یہ مقصد نہیں کہ دیگر انبیاء علیہم السلام کی زندگیاں، ان کے عہد اور زمانے میں ان خصوصیات سے خالی تھیں بلکہ یہ مقصد ہے کہ ان کی سیرتیں جو ان کے بعد عام انسانوں تک پہنچیں یا جو آج موجود ہیں، وہ ان خصوصیات سے خالی ہیں اور ایسا ہونا مصلحتِ الٰہی کے مطابق تھا تا کہ یہ ثابت ہو سکے کہ وہ انبیائے کرام علیہم السلام محدود زمانے اور متعین قوموں کے لیے تھے۔ اس لیے ان کی سیرتوں کو دوسری قوم اور آیندہ ہر زمانہ تک محفوظ رہنے کی ضرورت نہ تھی، صرف محمد رسول اللہ ﷺ تمام دنیا کی قوموں کے لیے اور قیامت تک کے لیے نمونۂ عمل اور قابلِ تقلید بنا کر بھیجے گئے تھے، اس لیے آپ کی سیرت کو ہر حیثیت سے مکمل، دائمی اور ہمیشہ کے لیے محفوظ رہنے کی ضرورت تھی اور یہی ختمِ نبوت کی سب سے بڑی عملی دلیل ہے۔

سیرتِ نبوی ﷺ کا تاریخی پہلو

پیغمبر اسلام ﷺ کی سیرت مبارکہ پر نظر ڈالیں تو پتہ چلتا ہے کہ سب سے پہلی چیز تاریخی حیثیت ہے، دنیا اس بات پر متفق ہے کہ اس حیثیت سے اسلام نے اپنے پیغمبر ﷺ کی اور نہ صرف اپنے پیغمبر کی بلکہ ہر اس چیز کی اور اس شخص کی جس کا ادنیٰ سا تعلق بھی آپ ﷺ کی ذات مبارک سے تھا، جس طرح حفاظت کی ہے وہ عالم کے لیے باعثِ حیرت ہے۔ ان لوگوں کو جو نبی ﷺ کے اقوال، افعال اور متعلقاتِ زندگی کی روایت، تحریر اور تدوین کا فرض انجام دیتے تھے، راویانِ حدیث، محدثین اور اہل سیرت کہتے ہیں جن میں صحابۂ کرام رضی اللہ عنہم، تابعین، تبع تابعین رحمہم اللہ اور بعد کے چوتھی صدی ہجری تک کے اشخاص داخل ہیں۔ جب تمام سرمایۂ روایت تحریری صورت میں آ گیا تو ان تمام راویوں کے نام ونشان، تاریخِ زندگی، اخلاق و عادات کو بھی قیدِ تحریر میں لایا گیا جن کی تعداد ایک لاکھ کے قریب ہے اور ان سب کے مجموعۂ احوال کا نام ''اسماء الرجال'' ہے۔ مشہور جرمن ڈاکٹر ''اسپرنگر'' جو 1854ء اور اس کے بعد تک ہندوستان کے علمی اور تعلیمی شعبے سے متعلق تھے اور ''بنگال ایشاٹک سوسائٹی'' کے سیکرٹری تھے اور ان کے عہد میں خود ان کی محنت سے واقدی کی مغازی وان کریمر کی

ادارت میں 1856ء میں شائع ہوئی اور صحابۂ کرام کے حالات میں حافظ ابن حجر رحمہ اللہ کی ''الإصابة في تمييز الصحابة'' طبع ہوئی اور جنھوں نے (جیسا کہ ان کا دعویٰ ہے کہ وہ پہلے یورپین شخص ہیں جس نے خاص ابتدائی عربی ماخذوں سے) ''لائف آف محمد'' لکھی ہے اور مخالفانہ لکھی ہے، وہ بھی الاصابہ کے انگریزی مقدمہ مطبوعہ کلکتہ 1853ء، 1864ء میں لکھتے ہیں:

''کوئی قوم دنیا میں ایسی گزری نہ آج موجود ہے جس نے مسلمانوں کی طرح اسماء الرجال کا عظیم الشان فن ایجاد کیا ہو جس کی بدولت آج پانچ لاکھ اشخاص کا حال معلوم ہوسکتا ہو۔''

صحابۂ کرام کی تعداد حیات نبوی ﷺ کے اخیر سال حجۃ الوداع میں تقریباً ایک لاکھ تھی۔ ان میں گیارہ ہزار آدمی ایسے ہیں جن کے نام ونشان آج تحریری صورت میں تاریخ کے اوراق میں جو خاص انھی کے حالات میں لکھے گئے ہیں، اس لیے موجود ہیں کہ یہ وہ لوگ ہیں جن میں سے ہر ایک نے کم وبیش نبی ﷺ کے اقوال وافعال اور واقعات میں سے کچھ نہ کچھ حصہ دوسروں تک پہنچایا ہے، یعنی جنھوں نے روایت کی خدمت انجام دی ہے اور یہی سبب ان کی تاریخی زندگی کا ہے۔

11ھ میں نبی ﷺ نے وفات پائی اور تقریبا 40ھ تک اکابر صحابہ رضی اللہ عنہم عالم وجود میں رونق افروز رہے۔ 60ھ تک اصاغر صحابہ رضی اللہ عنہم کی جو عہد نبوت میں کم سن تھے، خاصی تعداد موجود تھی اور صدی کے ختم ہونے تک اس نورِ نبوت کا تقریباً ہر چراغ گل ہوگیا تھا۔ ہر شہر میں سب سے آخر وفات پانے والے صحابیوں کے نام اور سال وفات یہ ہیں:

نمبر شمار	اسم گرامی	نام شہر	سال وفات
1	ابوامامہ باہلی رضی اللہ عنہ	شام	86ھ
2	عبداللہ بن حارث بن جزء رضی اللہ عنہ	مصر	86ھ
3	عبداللہ بن ابی اوفیٰ رضی اللہ عنہ	کوفہ	87ھ
4	سائب بن یزید رضی اللہ عنہ	مدینہ منورہ	91ھ
5	انس بن مالک رضی اللہ عنہ	بصرہ	93ھ

حضرت انس بن مالک رضی اللہ عنہ جنھوں نے اس فہرست میں سب سے آخر جگہ پائی ہے، وہ آپ ﷺ کے خادمِ خاص تھے۔ دس برس تک مسلسل نبی ﷺ کی خدمت میں رہے، وہ 93ھ میں وفات پاتے ہیں۔

تابعین رحمہم اللہ، یعنی صحابۂ کرام رضی اللہ عنہم کے تلامذہ کا دور یکم ہجری کے آغاز سے اس طرح شروع ہوتا ہے کہ اگرچہ وہ پیدا ہوچکے تھے مگر نبی ﷺ کی زیارت سے محروم رہے یا بہت بچے تھے اور آپ ﷺ کا فیض نہ حاصل کر سکے، چنانچہ عبدالرحمٰن بن حارث تابعی تقریباً 3ھ میں، قیس بن ابی حازم 4ھ میں اور سعید بن مسیّب رحمہ اللہ 14ھ میں پیدا ہوچکے تھے۔ یہ دکھانے کے لیے کہ صحابہ کے بعد گروہ درگروہ تابعین رحمہم اللہ جو دنیائے اسلام کے گوشہ گوشہ میں پھیلے تھے اور رسول اللہ ﷺ کے وقائع و حالات اور احکام و قضایا کی تعلیم و تبلیغ اور اشاعت میں مصروف تھے، ان کی مجموعی تعداد کیا ہوگی؟ میں صرف مدینہ کے تابعین کی تعداد ابن سعد کے حوالہ سے بتاتا ہوں۔ طبقۂ اولیٰ، یعنی ان تابعیوں کی تعداد جنھوں نے بڑے بڑے صحابہ رضی اللہ عنہم کو دیکھا تھا اور ان سے واقعات و مسائل سنے تھے، 139 ہے۔ طبقۂ دوم، یعنی وہ تابعی جنھوں نے مدینہ میں

عام صحابیوں کو دیکھا اوران سے سنا، 129 ہیں۔ طبقۂ سوم کے وہ تابعین جنھوں نے متعدد یا کسی ایک صحابی کو دیکھا اوران سے سنا، 87 ہیں۔ اس طرح تابعین کی کل تعداد 355 ہے۔ یہ تعداد صرف ایک شہر کی ہے۔ اسی سے مکہ معظمہ، طائف، بصرہ، کوفہ، دمشق، یمن اور مصر وغیرہ کے ان تابعیوں کا اندازہ لگاؤ جو اپنے اپنے شہروں میں صحابۂ کرام رضی اللہ عنہم کے تلامذہ کا شرف رکھتے تھے اورجن کے شب و روز کا مشغلہ ہی آپ ﷺ کے قول وفعل کی اشاعت وتبلیغ تھی۔ اس بات کا اہتمام کیا گیا کہ ہر صحابی سے جو کچھ روایتیں ہیں ان میں سے ہر ایک کا شمار کرلیا گیا اور وہ گن لی گئیں۔ اس سے اندازہ کرو کہ آپ ﷺ کے حالات واقوال کی فراہمی میں کس قدر بلیغ اہتمام کیا گیا ہے۔ صحابۂ کرام رضی اللہ عنہم میں سے جن اصحاب کی سب سے زیادہ روایتیں ہیں، وہ حسب ذیل ہیں:

نمبر شمار	اسم گرامی	روایتوں کی تعداد	سال وفات
1	حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ	5374	59ھ
2	حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما	2660	68ھ
3	حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا	2210	58ھ
4	حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما	1630	73ھ
5	حضرت جابر بن عبداللہ رضی اللہ عنہما	1560	78ھ
6	حضرت انس بن مالک رضی اللہ عنہ	1286	93ھ
7	حضرت ابوسعید خدری رضی اللہ عنہ	1170	74ھ

یہی وہ لوگ ہیں جن کی روایات آج سیرتِ نبوی ﷺ کا سب سے بڑا سرمایہ ہیں۔ ان کی وفات کی تاریخوں پر نظر ڈالو تو معلوم ہوگا کہ ان سے فیض اٹھانے اوران

کی روایتوں کو حفظ اور تدوین کرنے والوں کی تعداد بے شمار ہوگی۔ انھی باتوں کی واقفیت اور آگاہی کا نام اس زمانے میں علم تھا اور وہ دینی اور دنیاوی دونوں عزتوں کا ذریعہ تھیں۔ اس لیے ہزاروں صحابہ رضی اللہ عنہم نے جو کچھ دیکھا اور جانا تھا، نبی ﷺ کے حکم:

«بَلِّغُوْا عَنِّي»

''مجھ سے جو کچھ سنو اور دیکھو اس کی اشاعت کرو۔'' ①

یا «فَلْيُبَلِّغِ الشَّاهِدُ الْغَائِبَ»

''جو مجھے دیکھ رہے ہیں اور مجھ سے سن رہے ہیں وہ ان کو مطلع کردیں، جو اس سے محروم رہے ہیں۔'' ②

کے مطابق وہ سب اپنی اپنی اولادوں، عزیزوں، دوستوں اور ملنے والوں کو سناتے اور بتاتے رہتے تھے۔ یہی ان کی زندگی کا کام اور یہی ان کے شب و روز کا مشغلہ تھا۔ اس لیے صحابۂ کرام رضی اللہ عنہم کے فوراً بعد ہی دوسری نوجوان پود، ان معلومات کی حفاظت کے لیے کھڑی ہوگئی۔ ان میں سے ہر ایک کو ہر واقعے کا لفظ لفظ یاد کرنا پڑتا تھا، ان کو دہرانا پڑتا تھا اور حرفاً حرفاً محفوظ رکھنا پڑتا تھا۔

آپ ﷺ نے جہاں اپنے اقوال و افعال کی اشاعت کی تاکید کی تھی وہاں یہ بھی ہدایت کردی تھی کہ ''جو کوئی میرے متعلق قصداً کوئی غلط یا جھوٹی بات بیان کرے گا، اس کا ٹھکانہ جہنم ہوگا۔'' ③

اس اعلان کا یہ اثر تھا کہ بڑے بڑے صحابۂ کرام رضی اللہ عنہم روایت کرتے وقت کانپنے

---

① صحيح البخاري، حديث: 3461. ② صحيح البخاري، حديث: 1739. ③ صحيح البخاري، حديث: 107.

لگتے تھے۔ حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ نے ایک دفعہ آپ ﷺ کی کوئی بات نقل کی تو چہرے کا رنگ بدل گیا، تھرا گئے، پھر کہا: ''نبی ﷺ نے ایسا ہی فرمایا تھا، یا اسی کے قریب قریب فرمایا تھا۔''①

عربوں کا حافظہ فطرۃً نہایت قوی تھا۔ وہ سیکڑوں شعروں کے قصیدے زبانی یاد رکھتے تھے۔ اس کے علاوہ فطرت کا قاعدہ یہ ہے کہ جس قوت سے جس قدر کام لیا جائے اسی قدر اس کی زیادہ ترقی ہوتی ہے۔ صحابہ اور تابعین نے قوت حفظ کو معراجِ کمال تک پہنچایا۔ وہ ایک ایک واقعہ اور ایک ایک حدیث کو اس طرح زبانی سن کر یاد کرتے تھے جیسے مسلمان آج قرآن مجید یاد کرتے ہیں۔ ایک ایک محدث کئی کئی ہزار اور کئی کئی لاکھ حدیثیں زبانی یاد کرتا تھا اور یاد رکھتا تھا۔ اگرچہ بعد میں لوگ اپنی یادداشت کے لیے لکھ بھی لیتے تھے مگر جب تک وہ زبانی یاد نہ رکھتے، اہل علم کی نگاہوں میں ان کی عزت نہیں ہوتی تھی اور وہ خود اپنی تحریری یادداشتوں کو عیب کی طرح چھپاتے تھے تاکہ لوگ ایسا نہ سمجھیں کہ ان کو یہ چیزیں یاد نہیں ہیں۔

دوستو! بعض مستشرق اسکالرز اور بعض پڑھے لکھے مشنریوں نے جن میں سب سے آگے سرولیم میور اور گولڈ زیہر ہیں، اس بنا پر کہ روایت نبوی ﷺ کی تحریر و تدوین کا کام نبی ﷺ کی وفات کے 90 برس بعد شروع ہوا، ان کی صحت اور وثوق میں شک پیدا کرنا چاہا۔ مگر ہم نے جس طرح اوپر تفصیل سے آپ کے سامنے پوری روداد رکھی ہے اور بتایا ہے کہ صحابہ رضی اللہ عنہم کس طرح واقعات کو یاد رکھتے تھے، کس طرح احتیاط برتتے تھے، کس طرح آنے والی نسلوں کو وہ امانت سپرد کرتے تھے، اس سے خود اندازہ

① المعجم الكبير للطبراني: 123/9.

ہوگا کہ اگر چہ وہ روایات تحریری صورت میں بہت بعد کو آئی ہوں تاہم ان کی صحت اور وثوق میں کوئی شک نہیں کیا جاسکتا۔ صحابہ رضی اللہ عنہم نے اپنی معلومات کو عموماً تین اسباب سے قیدِ تحریر میں لانا مناسب نہیں سمجھا۔

❁ ابتداءً نبی ﷺ نے قرآن مجید کے علاوہ کسی اور چیز کو کتاب کی صورت میں لکھنے کی ممانعت کردی تھی اور فرمایا تھا:

«لَا تَكْتُبُوا عَنِّي وَمَنْ كَتَبَ عَنِّي غَيْرَ الْقُرْآنِ فَلْيَمْحُهُ»

''میرا کلام نہ لکھو اور جس نے قرآن کے علاوہ مجھ سے کچھ لکھا ہو، وہ اسے مٹا دے۔''[1]

یہ اس لیے تھا کہ عام لوگوں کو قرآن اور غیر قرآن میں باہمی التباس نہ ہوجائے، چنانچہ جب قرآن مجید مسلمانوں میں پوری طرح محفوظ ہوگیا تو آخر میں خود ہی آپ ﷺ نے صحابہ رضی اللہ عنہم کو احادیث کی تحریر کی اجازت دے دی۔ اس پر بھی اکثر صحابۂ کرام رضی اللہ عنہم ان کو قیدِ تحریر میں لانے سے اخیر دم تک احتیاط برتتے رہے۔

❁ صحابہ کو ڈر تھا کہ وقائع کے تحریری صورت میں آجانے کے بعد لوگوں کو پھر ان کے ساتھ وہ توجہ اور مشغولیت باقی نہیں رہے گی اور لوگ تحریری مجموعہ کے موجود رہنے کے سبب سے ان کے حفظ اور زبانی یاد رکھنے کی صورت و محنت سے جی چرائیں گے۔ یہ ڈر بالکل صحیح ثابت ہوا، چنانچہ جیسے جیسے سفینوں کا علم بڑھتا گیا سینوں کا علم گھٹتا گیا۔ نیز اسی سلسلے میں ان کو یہ بھی خیال تھا کہ ہر کس و ناکس کتاب کے مجموعہ کو ہاتھ میں لے کر عالم بننے کا دعویٰ کر بیٹھے گا، چنانچہ یہ بھی ہوا۔

[1] صحیح مسلم، حدیث:3004.

۞ تیسری وجہ یہ تھی کہ ابھی تک عرب میں کسی واقعے کولکھ کر اپنے ذہن میں محفوظ رکھنا معیوب سمجھا جاتا تھا اور لوگ اس کو اپنی کمزوری کا اعلان تصور کرتے تھے، اس لیے کوئی چیز تحریر بھی کر لیتے تو اس کو چھپائے رکھتے تھے۔

محدثین کا خیال تھا کہ زبانی یادداشت تحریری یاد داشت سے زیادہ محفوظ صورت ہے۔ تحریری یادداشت کو دوسروں کے تصرف سے محفوظ نہیں رکھا جاسکتا۔ ہر وقت خطرہ رہتا ہے کہ کوئی اس میں کمی بیشی نہ کرے۔ مگر جو نقوش دلوں کی لوحوں پر کندہ ہو جاتے ہیں، ان میں تبدیلی ممکن نہیں۔

آج پہلی دفعہ آپ کی مجلس میں اور سب سے پہلے آپ کی مجلس میں اس حقیقت کو آشکارا کیا جاتا ہے کہ یہ قطعاً غلط ہے کہ سو برس یا نوے برس تک وقائع و اقوال نبوی ﷺ کا دفتر صرف زبانی روایتوں تک محدود رہا۔ اس غلط فہمی کا اصل سبب یہ ہے کہ احادیث و اخبار نبوی ﷺ کی پہلی کتاب امام مالک رحمہ اللہ کی ''موطأ'' اور مغازی و سیرت میں ابن اسحاق رحمہ اللہ کی کتاب ''المغازی'' سمجھی جاتی ہے۔ یہ دونوں بزرگوار ہم عصر تھے اور ان کی وفات بہ ترتیب 179ھ اور 151ھ میں ہوئی، حالانکہ اس سے بہت پہلے احادیث و اخبار کی ترتیب و تدوین کا سراغ لگتا ہے۔

حضرت عمر بن عبدالعزیز رحمہ اللہ نے 101ھ میں وفات پائی۔ وہ خود بڑے عالم تھے۔ مدینہ کے امیر بھی رہ چکے تھے۔ 99ھ میں خلیفہ ہوئے۔ انھوں نے اپنی خلافت کے زمانے میں مدینہ منورہ کے قاضی ابوبکر بن محمد بن عمرو بن حزم کو جو حدیث و خبر کے بڑے امام تھے، فرمان بھیجا کہ نبی ﷺ کے سنن و اخبار کی تحریر و تدوین کا کام شروع کردو کیونکہ مجھے رفتہ رفتہ علم کے گم ہو جانے کا ڈر ہو رہا ہے۔'' یہ واقعہ بخاری، موطأ اور

سنن دارمی وغیرہ میں مذکور ہے۔[1] چنانچہ اس فرمان کی تعمیل کی گئی اور اخبار و احادیث وسنن دفاتر میں لکھ کر دارالخلافہ میں آئے اوران کی نقلیں تمام ممالکِ اسلامیہ کے مرکزی شہروں میں بھیجی گئیں۔ ابوبکر بن محمد بن عمرو بن حزم کا انتخاب اس کام کے لیے اس لیے ہوا کہ وہ خود امام تھے۔ مدینۃ العلم، مدینہ منورہ میں قاضیِ وقت تھے لیکن اس کے علاوہ اس لیے بھی یہ انتخاب موزوں تھا کہ ان کی خالہ عَمْرَہ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کی سب سے بڑی شاگرد تھیں اوران کی روایتیں جو حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے تھیں، ان کا سرمایہ ابوبکر بن حزم کے پاس پہلے سے جمع تھا، چنانچہ حضرت عمر بن عبدالعزیز رحمہ اللہ نے ان کو خاص حضرت عمرہ کی روایتوں کی تدوین کے متعلق بھی حکم دیا تھا۔

عہد نبوی ﷺ کا تحریری سرمایہ

عہد نبوی ﷺ ہی میں اخبار و سیر اور احکام وسنن کا تحریری سرمایہ جمع ہونا شروع ہو چکا تھا۔ فتح مکہ کے موقع پر آپ ﷺ نے ایک خطبہ دیا تھا۔ صحیح بخاری میں ہے کہ ابوشاہ رضی اللہ عنہ ایک یمنی صحابی کی درخواست پر آپ ﷺ نے یہ خطبہ لکھ کر ان کے حوالے کرنے کا حکم دیا۔[2]

نبی ﷺ نے سلاطینِ عالم کے نام جو خطوط* روانہ کیے، وہ لکھے ہوئے تھے۔ دس

[1] سنن الدارمي، حديث:490، وصحيح البخاري، قبل الحديث: 100. [2] صحيح البخاري، حديث:2434.

* نبی ﷺ چونکہ پوری کائناتِ انسانی کے لیے تشریف لائے، اس لیے آپ ﷺ نے اللہ کا پیغام اطراف و اکنافِ عالم میں پہنچانے کے لیے صحابۂ کرام رضی اللہ عنہم کو مبلغ اور سفیر بنا کر بھیجا اور بے شمار ممالک اور قبائل کی طرف خطوط روانہ فرمائے۔ تاریخ نے ایسے دو اڑھائی سو خطوط محفوظ کیے ہیں جو »

پندرہ برس ہوئے کہ مصر میں آپ ﷺ کا وہ خط جو مقوقس شاہِ مصر کے نام آپ ﷺ نے بھیجا تھا، ایک عیسائی گرجے کی کسی کتاب کی جلد میں لگا ہوا ملا ہے۔ گمان کیا جاتا ہے کہ وہ بعینہٖ وہی خط مبارک ہے جو آپ ﷺ نے لکھوایا تھا۔ اس کے فوٹو عام طور سے ملتے ہیں۔ یہ پرانے عربی خط میں ہے اور اس کی وہی عبارت ہے اور مہر میں نام کے وہی الفاظ اور صورتِ تحریر ہے جس طرح حدیث میں بیان آیا ہے۔ یہ اسلامی روایات کی صداقت کی کتنی بڑی دلیل ہے۔

حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ کہتے ہیں کہ عبداللہ بن عمرو بن عاص رضی اللہ عنہما کے سوا مجھ سے زیادہ کسی کو حدیث یاد نہیں۔ مجھ سے زیادہ ان کے پاس حدیثوں کا سرمایہ ہونے کی وجہ یہ ہے کہ وہ آپ ﷺ سے جو کچھ سنتے اس کو لکھتے جاتے تھے اور میں لکھتا نہ تھا۔[1]

سنن ابوداود اور مسند احمد میں ہے کہ بعض لوگوں نے عبداللہ بن عمرو رضی اللہ عنہما سے کہا کہ آپ ﷺ کبھی غصے کی حالت میں ہوتے ہیں، کبھی خوش رہتے ہیں اور تم سب کچھ لکھ لیتے ہو۔ عبداللہ بن عمرو رضی اللہ عنہما نے اس بنا پر لکھنا چھوڑ دیا اور آپ ﷺ سے یہ واقعہ بیان کیا۔ آپ ﷺ نے دہن مبارک کی طرف اشارہ کر کے فرمایا کہ

''تم لکھ لیا کرو، اس سے جو کچھ نکلتا ہے، حق نکلتا ہے۔''[2]

»» آپ ﷺ نے حکمرانوں، سرداروں اور گورنروں کو روانہ فرمائے۔ ان میں سے پانچ مکتوباتِ اقدس اصلی حالت میں دستیاب ہوئے ہیں جو حبشہ کے بادشاہ، مصر کے حکمران، بحرین کے گورنر، قیصرِ روم کے نام، فارس کے بادشاہ خسرو پرویز کے نام ارسال فرمائے تھے۔ خسرو پرویز کے نام مکتوب نبوی مئی 1963ء میں لبنان کے وزیر خارجہ ہنری فرعون کے آبائی ذخیرے سے دریافت ہوا۔ مصر کے بادشاہ کے نام لکھا گیا خط مبارک ترکی کے مشہور عجائب گھر توپ کاپی (Topkapi) میں محفوظ ہے۔

[1] صحيح البخاري، حديث: 113. [2] سنن أبي داود، حديث:3646.

عبداللہ بن عمرو رضی اللہ عنہما نے اپنے اس مجموعے کا نام ''صادقہ'' رکھا تھا۔[1] اور کہا کرتے تھے کہ مجھے اپنی زندگی کی آرزو صرف دو چیزوں نے پیدا کردی ہے جن میں ایک یہ صادقہ ہے اور صادقہ وہ صحیفہ ہے جو میں نے رسول اللہ ﷺ سے سن کر لکھا ہے۔[2]

مجاہد کہتے ہیں کہ ہم نے عبداللہ بن عمرو رضی اللہ عنہما صحابی کے پاس ایک کتاب رکھی دیکھی۔ دریافت کیا کہ یہ کیا ہے؟ فرمایا: صادقہ ہے جس کو میں نے خود آپ ﷺ سے سنا۔ جس میں میرے اور آپ ﷺ کے درمیان کوئی دوسرا نہیں ہے۔[3]

صحیح بخاری میں ہے کہ نبی ﷺ نے مدینہ آنے کے کچھ مدت بعد مسلمانوں کی مردم شماری کرائی اور ان کے نام لکھوائے تو پندرہ سو ہوئے۔[4] زکاۃ کے احکام، مختلف چیزوں پر زکاۃ کی مختلف شرحیں جو پورے دو صفحوں میں ہیں، ان کو لکھوا کر آپ ﷺ نے امراء کو بھیجا تھا اور وہ حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کے پاس، ابوبکر بن عمرو بن حزم رضی اللہ عنہ کے خاندان میں اور متعدد اشخاص کے پاس موجود تھیں۔ زکاۃ کے محصلین کے پاس دیگر تحریری ہدایتیں بھی موجود تھیں۔[5]

حضرت علی رضی اللہ عنہ کے پاس ایک صحیفہ تھا جو ان کی تلوار کے نیام میں پڑا رہتا تھا، اس میں متعدد حدیثیں متعلقۂ احکام قلم بند تھیں اور انھوں نے اس کو لوگوں کی درخواست پر دکھایا۔[6] حدیبیہ میں جو صلح نامہ نبی ﷺ اور کفارِ قریش کے درمیان حضرت علی رضی اللہ عنہ نے لکھا تھا، اس کی ایک نقل قریش نے لے لی اور ایک آپ ﷺ نے اپنے پاس رکھی۔[7] عمرو بن حزم رضی اللہ عنہ کو جب رسول اللہ ﷺ نے یمن کا حاکم بنا کر بھیجا تو ایک تحریر لکھوا کر

① طبقات ابن سعد:373/2. ② سنن الدارمي، حديث:499. ③ طبقات ابن سعد:373/2.
④ صحيح البخاري، حديث:3060. ⑤ سنن الدارقطني، حديث:1965-1968. ⑥ صحيح البخاري، حديث:111. ⑦ طبقات ابن سعد:97/2.

حوالے کی جس میں فرائض اور صدقات وغیرہ کے متعلق بہت سی ہدایتیں تھیں۔[1]

عبداللہ بن عُکَیم رضی اللہ عنہ کے پاس رسول اللہ ﷺ کا نامہ پہنچا جس میں مردہ جانور کے متعلق حکم درج تھا۔[2] وائل بن حجر رضی اللہ عنہ صحابی جب بارگاہِ نبوی سے اپنے وطن حضرموت جانے لگے تو آپ ﷺ نے ان کو خاص طور پر ایک نامہ لکھوا کر دیا جس میں نماز، روزہ، سود، شراب اور دیگر احکام تھے۔[3] ایک دفعہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے مجمع سے پوچھا کہ کس کو معلوم ہے کہ آپ ﷺ نے شوہر کی دیت میں سے بیوی کو کیا دلایا؟ ضحاک بن سفیان رضی اللہ عنہ نے کھڑے ہو کر کہا: ''مجھے معلوم ہے آپ ﷺ نے ہم کو یہ لکھوا کر بھیجا تھا۔''[4]

حضرت عمر بن عبدالعزیز رحمہ اللہ نے اپنے عہدِ خلافت (99، 101ھ) میں صدقات سے متعلق آپ ﷺ کے فرمان کی تلاش کے لیے اہل مدینہ کے پاس قاصد بھیجا تو وہ آلِ عمرو بن حزم رضی اللہ عنہ کے ہاں مل گیا۔[5] نبی ﷺ نے اہل یمن کو جو احکام لکھوا کر بھجوائے تھے ان میں یہ مسئلے تھے: قرآن صرف پاکی کی حالت میں چھوا جائے۔ غلام خریدنے سے پہلے آزاد نہیں کیا جاسکتا اور نکاح سے پہلے طلاق نہیں۔[6]

حضرت معاذ رضی اللہ عنہ نے یمن سے خط لکھ کر آپ ﷺ سے یہ دریافت کیا کہ کیا سبزیوں میں زکاۃ ہے؟ آپ ﷺ نے تحریری جواب دیا کہ سبزیوں پر زکاۃ نہیں۔[7]

مروان نے خطبہ میں بیان کیا کہ مکہ حرم ہے تو رافع بن خدیج رضی اللہ عنہ صحابی نے پکار کر کہا:

---

[1] أسد الغابة: 365/3، رقم: 3905. [2] المعجم الصغير للطبراني، حديث: 1050,618. [3] المعجم الصغير للطبراني، حديث: 1176. [4] سنن أبي داود، حديث: 2927. [5] سنن الدارقطني، حديث: 1968. [6] سنن الدارمي، حديث: 2263. [7] سنن الدارقطني، حديث: 1892. (إسناده ضعيف).

اور مدینہ بھی حرم ہے اور یہ حکم میرے پاس لکھا ہوا موجود ہے۔ اگر تم چاہو تو میں اس کو پڑھ کر سناؤں۔"[1] ضحاک بن قیس نے نعمان بن بشیر رضی اللہ عنہ صحابی کو لکھا کہ نبیِ کریم ﷺ جمعہ کی نماز میں سورۂ جمعہ کے سوا اور کون سی سورت پڑھتے تھے۔ انھوں نے جواب لکھا کہ ﴿هَلْ أَتٰىكَ حَدِيثُ الْغَاشِيَةِ﴾ پڑھتے تھے۔[2] حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے عتبہ بن فرقد کو خط لکھا کہ آپ ﷺ نے حریر پہننے سے منع فرمایا ہے۔[3]

یہ وہ احکام و مسائل ہیں جو آپ ﷺ نے مختلف لوگوں کو لکھوا کر دیے یا بجھوائے۔

ہمارے پاس ایسے شواہد بھی ہیں، جن سے ثابت ہوتا ہے کہ بڑے بڑے صحابہ رضی اللہ عنہم احکام و سنن کو کتابی صورت میں لائے یا لانا چاہتے تھے۔ حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ نے ایک مجموعہ اپنے زمانۂ خلافت میں مرتب کیا، پھر اس کو پسند نہ کیا اور مٹا دیا۔[4] حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے اس مسئلے پر اپنے زمانۂ خلافت میں غور کیا اور بہت کچھ سوچتے رہے۔ مگر پھر ہمت نہ کی۔ ابھی آپ سن چکے ہیں کہ حضرت عبداللہ بن عمرو رضی اللہ عنہما نے خود آپ ﷺ کی اجازت سے ایک نسخہ لکھا تھا جس میں آپ ﷺ کے ملفوظات تھے۔ مختلف لوگ اس کو دیکھنے آتے تھے اور وہ اس کو دکھاتے تھے۔[5] حضرت علی رضی اللہ عنہ کے فتاویٰ کا بڑا حصہ لکھا ہوا حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما کی خدمت میں لایا گیا۔[6] حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما کی روایتوں کے مختلف تحریری مجموعے تھے، اہل طائف میں سے کچھ لوگ ان کا ایک مجموعہ ان کو پڑھ کر سنانے کے لیے لائے۔[7] سعید بن جبیر ان کی روایتوں کو لکھا کرتے تھے۔[8]

---

[1] صحيح مسلم، حديث: 1361، و مسند أحمد: 141/4. [2] صحيح مسلم، حديث: 878.
[3] صحيح مسلم، حديث: 2069. [4] تذكرة الحفاظ: 11/1. [5] جامع الترمذي، حديث: 3529. [6] صحيح مسلم، المقدمة، رقم: 23. [7] العلل للترمذي، ص: 896. [8] سنن الدارمي، حديث: 498.

عبداللہ بن عمرو رضی اللہ عنہما کا صحیفہ صادقہ ان کے پوتے عمرو بن شعیب کے پاس موجود تھا۔[1] اور وہ اس لیے ضعیف سمجھے جاتے تھے کہ اپنے دادا کی کتاب دیکھ کر روایت کرتے ہیں، خود حافظ نہیں ہیں۔[2]

حضرت جابر بن عبداللہ رضی اللہ عنہما کی روایتوں کا مجموعہ وہب تابعی نے تیار کیا تھا جو اسماعیل بن عبدالکریم کے پاس تھا اور وہ اس لیے ضعیف سمجھے جاتے تھے۔[3] حضرت جابر رضی اللہ عنہ کی روایتوں کا دوسرا مجموعہ سلیمان بن قیس یشکری نے تیار کیا تھا اور ابوالزبیر، ابوسفیان اور شعبی نے جوائمہ حدیث میں سے ہیں اور تابعی ہیں، حضرت جابر رضی اللہ عنہ کے صحیفہ کو ان سے سنا تھا۔[4] سمرہ بن جندب رضی اللہ عنہ صحابی سے ان کے بیٹے سلیمان روایتوں کا ایک نسخہ روایت کرتے ہیں اور ان سے ان کے بیٹے حبیب۔[5] حضرت ابوہریرۃ رضی اللہ عنہ جن سے زیادہ صحابہ رضی اللہ عنہم میں کوئی حافظ حدیث نہ تھا، ان کی روایتوں کا کچھ مجموعہ ہمام بن منبہ نے تیار کیا تھا جو "صحیفۂ ہمام" کے نام سے احادیث میں مشہور ہے۔ اس کو امام ابن حنبل رحمہ اللہ نے مسند احمد جلد 2 میں صفحہ 312 سے صفحہ 318 تک نقل کیا ہے۔ بشیر ابن نہیک نے حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے ان کی روایتوں کا مجموعہ لکھا اور پھر اس کی روایت کی ان سے اجازت لے لی۔[6] حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ ایک دفعہ ایک صاحب کو اپنے ہاں بلا کر لائے اور دکھایا کہ یہ اوراق میرے مرویات ہیں۔ راوی کہتا ہے کہ وہ ان کے ہاتھ کے نہیں بلکہ کسی اور کے ہاتھ کے لکھے ہوئے تھے۔[7]

حضرت انس رضی اللہ عنہ دوسرے صحابی ہیں جن سے بکثرت روایتیں ہیں۔ وہ خود اپنے

[1] جامع الترمذي، بعد الحديث: 322. [2] تهذيب التهذيب: 8/44-47. [3] تهذيب التهذيب: 1/275,276. [4] تهذيب التهذيب: 4/188. [5] تهذيب التهذيب: 4/173. [6] العلل للترمذي، ص: 896. [7] فتح الباري: 1/207.

بیٹوں سے کہا کرتے تھے کہ ''میرے بچو! علم کو تحریر کی قید و بند میں لاؤ۔''①

حضرت ابان رضی اللہ عنہ ان کے شاگردان کے سامنے بیٹھ کر ان کی روایتیں قید تحریر میں لایا کرتے تھے۔② سلمیٰ ایک خاتون کہتی ہیں کہ انھوں نے حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما کو دیکھا کہ وہ ابو رافع رضی اللہ عنہ آپ ﷺ کے غلام سے آپ کے کارنامے لکھا کرتے تھے۔③ واقدی سیرت نبوی کے ابتدائی مصنفین میں سے ایک سے بیان کرتا ہے کہ منذر بن ساویٰ رئیسِ عمان کے نام آپ ﷺ نے جو خط بھیجا تھا وہ ابن عباس رضی اللہ عنہما کی کتابوں کے ساتھ میں نے دیکھا۔④ غزوۂ بدر کا مفصل حال عروہ بن زبیر رضی اللہ عنہما نے لکھ کر خلیفہ عبدالملک کو بھیجا تھا۔⑤

حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ آپ ﷺ کے خادمِ خاص تھے اوران کو آپ ﷺ کی بارگاہ میں حاضری کا اِذنِ عام تھا۔ ان کو شکایت تھی کہ لوگ میرے پاس آکر سن جاتے ہیں اور پھر اس کو جا کر لکھ لیتے ہیں اور میں قرآن کے سوا کسی اور چیز کے لکھنے کو حلال نہیں جانتا۔⑥ سعید بن جبیر تابعی کہتے ہیں کہ میں حضرت عبداللہ بن عمر اور ابن عباس رضی اللہ عنہم سے رات کو روایتیں سنتا تھا تو پالان پر لکھتا تھا، صبح کو پھر میں اس کو صاف کرلیتا تھا۔⑦ براء بن عازب رضی اللہ عنہ صحابی کے پاس لوگ بیٹھ کر ان کی روایتوں کو لکھا کرتے تھے۔⑧ نافع جو حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہما کی خدمت میں تیس برس رہے تھے، وہ اپنے سامنے لوگوں کو لکھوایا کرتے تھے۔⑨ عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ کے صاجزادے

① سنن الدارمي، حديث: 494. ② سنن الدارمي، حديث: 495. ③ طبقات ابن سعد: 371/2. ④ زاد المعاد: 692/2. ⑤ تاريخ الطبري: 131/2. ⑥ سنن الدارمي، حديث: 484. ⑦ سنن الدارمي، حديث: 498. ⑧ سنن الدارمي، حديث: 506. ⑨ سنن الدارمي، حديث: 810.

عبدالرحمٰن ایک کتاب نکال لائے اور قسم کھا کر کہا کہ یہ خود حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ کے ہاتھ کی لکھی ہوئی ہے۔[1] سعید بن جبیر رحمہ اللہ کہتے ہیں کہ ہم لوگوں میں بعض باتوں میں اختلاف ہوتا تھا تو ان کو لکھتے تھے۔ پھر حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہما کے پاس اس یادداشت کو چھپا کر لاتے تھے۔ ان سے پوچھتے تھے، اگر ان کو اس کا پتہ چل جاتا تو بس ہمارے ان کے درمیان فیصلہ یہی تھا۔[2]

اسود تابعی کہتے ہیں کہ مجھے اور علقمہ کو ایک صحیفہ مل گیا، اس کو لے کر ہم حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ کے پاس آئے تو انھوں نے اسے مٹا دیا۔[3] حضرت زید بن ثابت رضی اللہ عنہ کاتب وحی تھے، ان کو بھی روایتوں کو تحریر میں لانے سے انکار تھا تو مروان نے یہ تدبیر کی کہ ان کو سامنے بٹھایا اور پردہ کے پیچھے کاتب مقرر کیے کہ وہ جو بولتے جائیں یہ لکھتے جائیں۔[4] حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ نے بھی ان کو ایک حدیث اسی طرح لکھوائی تھی لیکن وہ تاڑ گئے اور زبردستی مٹوا دی۔[5]

حضرات! شاید آپ ٹھوس واقعات اور اشخاص کے نام سنتے سنتے گھبرا اٹھے ہوں لیکن اطمینان رکھیے کہ اب ہم اس مقام پر پہنچ گئے ہیں جہاں سے صاف اور سیدھا راستہ نظر آ رہا ہے۔ میں نے ان اقتباسات اور حوالوں میں یہ دکھایا ہے کہ تحریری سرمایہ ہی اگر دنیا میں قابلِ وثوق ہوسکتا ہے تو خود عہدِ نبوی ﷺ میں صحابہ رضی اللہ عنہم نے اپنے ہاتھوں سے اس کو جمع کیا اور پچھلوں کے لیے یادگار چھوڑا اور پچھلوں نے اس کو اپنی کتابوں میں داخل کرلیا۔ اب ہم یہ کہنا چاہتے ہیں کہ صحابہ رضی اللہ عنہم ہی کی زندگی میں

[1] جامع بیان العلم وفضله، رقم: 399. [2] جامع بیان العلم وفضله، رقم: 355. [3] جامع بیان العلم وفضله، رقم: 358. [4] جامع بیان العلم وفضله، رقم: 349. [5] مسند أحمد: ◄◄

تابعین نے تمام مرویات و واقعات اور حالات کو ایک ایک سے پوچھ کر، ایک ایک کے دروازے پر جا کر بوڑھے، جوان، عورت، مرد سب سے تحقیق کر کے ہمارے لیے فراہم کر دیا تھا۔ محمد بن شہاب زہری، ہشام بن عروہ، قیس بن ابی حازم، عطاء بن ابی رباح، سعید بن جبیر، ابو الزناد رحمہم اللہ وغیرہ سیکڑوں تابعین ہیں جنھوں نے دیوانہ وار ایک ایک گوشے سے دانہ دانہ جمع کیا اور ہمارے سامنے اس کا انبار لگا دیا۔ ابن شہاب زہری نے جو حدیث و سیرت کے بڑے امام ہیں، آپ ﷺ کی ایک ایک چیز کو لکھا۔ ابو الزناد کہتے ہیں کہ ہم صرف حلال و حرام لکھتے رہتے تھے اور زہری جو کچھ سنتے تھے وہ سب لکھتے تھے۔[1] ابن کیسان کہتے ہیں کہ میں اور زہری طلب علم میں ساتھ تھے۔ میں نے کہا کہ میں سنن لکھوں گا، چنانچہ جو کچھ آپ ﷺ سے متعلق تھا سب لکھا۔ زہری نے کہا کہ صحابہ رضی اللہ عنہم سے جو کچھ متعلق ہے وہ بھی لکھو کہ وہ بھی سنت ہے۔ میں نے کہا کہ وہ سنت نہیں ہے، چنانچہ میں نے نہیں لکھا۔ انھوں نے لکھا، نتیجہ یہ ہوا کہ وہ کامیاب ہوئے اور میں برباد ہوگیا۔[2] ان امور کو قید تحریر میں لانے والے سیکڑوں تابعی تھے جن میں سے ایک امام زہری ہیں۔ صرف ان کی تحریروں کا انبار اتنا تھا کہ ولید بن یزید کے قتل کے بعد زہری کے یہ دفتر جانوروں پر بار کر کے خزانہ سے لائے گئے تھے۔

امام زہری 50ھ میں پیدا ہوئے اور 124ھ میں وفات پائی۔ وہ نسباً قریشی تھے۔ انھوں نے جس محنت اور کاوش سے آپ ﷺ کے حالات اور اقوال جمع کیے اس کا

◄◄ 182/5، (إسناده ضعيف). ① جامع بيان العلم وفضله، رقم: 416. ② جامع بيان العلم وفضله، رقم: 442,441.

اندازہ مؤرخین کے اس بیان سے کرو کہ ''وہ مدینہ منورہ کے ایک ایک انصاری کے گھر جاتے۔ جوان، بوڑھے، عورت، مرد جو مل جاتا یہاں تک کہ پردہ نشین عورتوں سے جا کر آپ ﷺ کے اقوال اور حالات پوچھتے اور قلم بند کرتے۔''[1]

اس زمانے میں بکثرت صحابہ رضی اللہ عنہم زندہ تھے۔ زہری کے تلامذہ کی فہرست نہایت طویل ہے اور یہ تمام شب و روز نبی ﷺ کے اقوال و افعال اور احوال کی جمع اور ترتیب، تعلیم و تدریس اور نشر و اشاعت میں مشغول رہتے تھے۔ یہی ان کی زندگی کا کام تھا۔ اس کے سوا دنیا کے ہر کام سے وہ کنارہ کش ہو گئے تھے۔

غلط فہمی کا بڑا سبب یہ ہے کہ لوگ یہ سمجھتے ہیں کہ احادیث و سیر کی تدوین و تحریر کا کام تابعین نے شروع کیا اور تابعین ان کو کہتے ہیں جنھوں نے صحابہ رضی اللہ عنہم کو دیکھا اور ان سے فیض پایا۔ صحابہ کا زمانہ سو برس تک تقریباً رہا تو گویا تابعین کا عہد سو برس کے بعد شروع ہوا اور اس طرح گویا تدوین و تحریر کے سلسلہ کا آغاز سو برس بعد ہوا، حالانکہ یہ تمام تر غلط ہے۔ تابعین ان کو کہتے ہیں جنھوں نے آپ ﷺ کی زیارت کا شرف حاصل نہیں کیا اور صحابہ رضی اللہ عنہم کی زیارت کی اور ان سے مستفید ہوئے۔ عام اس سے کہ وہ آپ ﷺ کے زمانہ میں ہوں مگر زیارت کا موقع نہ ملا ہو یا عہد نبوی ﷺ کے آخر میں پیدا ہوئے، اس لیے آپ ﷺ سے فیض یاب نہ ہوئے یا آپ ﷺ کی وفات (ربیع الاول 11ھ) کے بعد پیدا ہوئے، وہ سب تابعین میں داخل ہیں۔ اس طرح دیکھیے تو معلوم ہوگا کہ تابعین کا عہد خود آپ ﷺ کی زندگی ہی میں اور کم سے کم یہ کہ 11ھ سے شروع ہو گیا تھا۔ اس لیے 11ھ سے جو کام شروع ہوا اس کے متعلق یہ

[1] تہذیب التہذیب: 9/397.

کہہ سکتے ہیں کہ تابعین نے اس کام کا آغاز کیا۔ تابعین کا کارنامہ ہونے کے لیے ایک ایک صحابی کے دنیا سے رخصت ہوجانے کی ضرورت نہیں اور نہ سو برس کا زمانہ گزارنے کی حاجت ہے۔ وہ تو تابعیت کا آخری عہد ہے جس کے بعد تابعیت کے شرف کا خاتمہ ہوتا ہے کیونکہ صحابہ رضی اللہ عنہم کے وجود کا خاتمہ ہوگیا جن کے دیدار کے شرف سے لوگ تابعی بنتے تھے۔ الغرض اس تفصیل سے ثابت ہوگا کہ یہ کہنا کس درجہ دھوکا ہے کہ مسلمانوں میں اخبار وسیر کی ترتیب کا کام سو برس کے بعد شروع ہوا۔

مسلمانوں میں اخبار و سیر اور احکام و سنن کی ترتیب اور تدوین کے درحقیقت تین دور ہیں:

① جب ہر شخص نے صرف اپنی ذاتی معلومات کو یکجا کیا۔

② دوسرا دور وہ آیا جب ہر شہر کی معلومات ایک جگہ فراہم کی گئیں۔

③ تیسرا دور وہ تھا جب تمام دنیائے اسلام کی معلومات اکٹھی کی گئیں اور ان کو موجودہ کتابوں کی صورت میں جمع کیا گیا۔

پہلا دور غالباً 100ھ تک قائم رہا۔ دوسرا دور 150ھ تک رہا اور تیسرا دور 150ھ سے تیسری صدی کے کچھ دنوں بعد تک رہا۔ پہلا دور صحابہ اور اکابر تابعین کا تھا۔ دوسرا دور تبع تابعین کا اور تیسرا دور امام بخاری، امام مسلم، امام ترمذی اور امام احمد بن حنبل رحمہم اللہ وغیرہ کا تھا۔ پہلے دور کا تمام سرمایہ دوسرے دور کی کتابوں میں ہے اور دوسرے دور کی کتابوں کا تمام مواد تیسرے دور کی کتابوں میں شامل کردیا گیا ہے۔ دوسرے اور تیسرے دور کی کتابوں کا سرمایہ آج ہزاروں اوراق میں ہمارے پاس موجود ہے اور دنیا کی تاریخ کا سب سے گراں بہا سرمایہ اور معتبر و مستند ذخیرہ ہے جس

سے زیادہ مستند اور معتبر دنیا کی تاریخ کے خزانے میں کوئی اور ذخیرہ نہیں۔

علامہ شبلی نعمانی کے بقول اس قسم کی زبانی روایتوں کے قلم بند کرنے کا موقع جب دوسری قوموں کو پیش آیا ہے، یعنی کسی زمانے کے حالات مدت کے بعد قلم بند کیے جاتے ہیں تو یہ طریقہ اختیار کیا جاتا ہے کہ ہر قسم کی بازاری افواہیں قلم بند کر لی جاتی ہیں جن کے راویوں کے نام و نشان تک معلوم نہیں ہوتے۔ ان افواہوں میں سے وہ واقعات قلم بند اور انتخاب کر لیے جاتے ہیں جو قرائن اور قیاسات کے مطابق ہوتے ہیں۔ تھوڑے زمانے کے بعد یہی خرافات ایک انتہائی دلچسپ تاریخی کتاب بن جاتے ہیں۔ یورپ کی اکثر یورپین تصنیفات اسی اصول پر لکھی گئی ہیں۔

لیکن مسلمانوں نے اس فنِ سیرت کا جو معیار قائم کیا وہ اس سے بہت زیادہ بلند تھا۔ اس کا پہلا اصول یہ تھا کہ جو واقعہ بیان کیا جائے اس شخص کی زبان سے بیان کیا جائے جو خود شریکِ واقعہ تھا اور اگر خود نہ تھا تو شریکِ واقعہ کے تمام درمیانی راویوں کے نام بہ ترتیب بیان کیے جائیں اور اس کے ساتھ یہ بھی تحقیق کی جائے کہ جو اشخاص سلسلۂ روایت میں آئے، کون لوگ تھے؟ کیسے تھے؟ ان کے مشاغل کیا تھے؟ ان کا چال چلن کیسا تھا؟ سمجھ کیسی تھی؟ ثقہ تھے یا غیر ثقہ تھے؟ سطحی الذہن تھے یا نکتہ رس؟ عالم تھے یا جاہل؟ ان جزئی باتوں کا پتہ لگانا سخت مشکل تھا لیکن سیکڑوں، ہزاروں محدثین نے اپنی عمریں اسی کام میں صرف کر دیں۔ ایک ایک شہر میں گئے، راویوں سے ملے، ان کے متعلق ہر قسم کے حالات و واقعات دریافت کیے۔ انھی تحقیقات کے ذریعے سے ''اسماء الرجال'' کا وہ عظیم الشان فن ایجاد کیا جس کی بدولت کم از کم ئی لاکھ شخصیتوں کے حالات معلوم ہو سکتے ہیں۔

یہ تو صرف روایت کے متعلق تھا۔ اصولِ تنقیداور درایت، یعنی عقلی حیثیت سے روایتوں کے پرکھنے کے اصول وقواعد الگ ترتیب دیے اور بتایا کہ کیونکر اس حیثیت سے روایتوں کی تصحیح یا تکذیب کی جاسکتی ہے۔ راویوں کی چھان بین اور تحقیق میں اس درجہ دیانت داری اور حق گوئی سے کام لیا کہ وہ واقعات آج اسلام کی علمی شان وشوکت میں شامل ہیں۔ راویوں میں بڑے بڑے خلفاء اور امراء بھی تھے جن کی تلواروں کی دھاک بیٹھی ہوئی تھی، مگر محدثین نے نڈر ہوکر سب کی پردہ دری کی اوران کو وہی درجہ دیا جواس بارگاہ میں ان کومل سکتا تھا۔

امام وکیع بڑے محدث تھے لیکن ان کے والد سرکاری خزانچی تھے۔ اس بناپر وہ خود ان سے جب روایت کرتے تو ان کی تائید میں کسی دوسرے راوی کوضرور ملا لیتے، یعنی تنہا اپنے باپ کی روایت کوتسلیم نہیں کرتے تھے۔ اس احتیاط اورحق پسندی کی کوئی حد ہے؟[1]

مسعودی رحمہ اللہ ٭ ایک محدث ہیں۔ 54ھ میں ایک امام معاذ بن معاذ نے ان کو دیکھا کہ ان کو اپنی تحریری یادداشت کے دیکھنے کی ضرورت ہوتی ہے تو انھوں نے فوراً ان کے حافظے سے اپنی بے اعتباری ظاہر کردی۔[2] یہی امام معاذ بن معاذ وہ بزرگ ہیں کہ ان کو ایک شخص نے دس ہزار دینار جس کی قیمت آج دس ہزار گنا سے زیادہ ہے صرف اس معاوضے میں پیش کرنے چاہے کہ وہ ایک شخص کومعتبر (عدل) اور غیر معتبر کچھ نہ کہیں، یعنی اس کے متعلق خاموش رہیں۔ انھوں نے اشرفیوں کے اس توڑے کو

① تہذیب التہذیب: 114/11. ② تہذیب التہذیب: 191/6.

٭ ان کا پورا نام عبدالرحمٰن بن عبداللہ بن عتبہ بن عبداللہ بن مسعود الکوفی المسعودی ہے۔

حقارت کے ساتھ ٹھکرا دیا اور فرمایا کہ ''میں کسی بھی حق کو چھپا نہیں سکتا۔''[1]

کیا تاریخ اس سے زیادہ احتیاط اور اس سے زیادہ دیانت داری کی کوئی مثال پیش کر سکتی ہے؟

اس سے زیادہ حیرت انگیز واقعہ یہ ہے کہ یہ تمام کچا پکا، صحیح اور غلط، قوی اور ضعیف، قابلِ قبول اور نا قابلِ قبول روایتوں کا انبار آج بھی دنیا کے سامنے ہے اور آج بھی انھی کے اصول کے مطابق ہر ایک واقعے کی پوری تنقید کی جا سکتی ہے اور کھرے کھوٹے کو الگ کیا جا سکتا ہے۔

حضرات! ان خشک باتوں میں آپ کا میں نے بہت وقت لیا۔ آپ ﷺ کی سیرت مبارکہ کا تاریخی پہلو اب بڑی حد تک سامنے آ گیا ہوگا۔ اب میں آپ کو بتانا چاہتا ہوں کہ آپ ﷺ کے حالات اور واقعات کا جو سرمایہ فراہم ہوا، اس کے کیا کیا ماخذ قرار پائے اور اس کو کس کس طرح ترتیب دیا گیا۔

❁ سیرت مبارکہ کا سب سے اہم، سب سے مستند، سب سے زیادہ صحیح تو وہ حصہ ہے جس کا ماخذ خود قرآن پاک ہے جس کی صحت اور معتبری میں دوست کیا دشمن بھی شک نہ کر سکے۔ آپ ﷺ کی سیرت کے تمام ضروری اجزاء، قبلِ نبوت کی زندگی، یتیمی، غربت، تلاشِ حق، نبوت، وحی، اعلان و تبلیغ، معراج، مخالفین کی دشمنی، ہجرت، لڑائیاں، وقائع، اخلاق سب اس میں موجود ہیں اور اس سے زیادہ معتبر تاریخی سیرت دنیا کے پردہ پر کوئی موجود نہیں ہے۔

❁ دوسرا ماخذ احادیث ہیں جو ایک لاکھ کے قریب ہیں جن میں صحیح الگ، کمزور الگ

[1] تهذيب التهذيب: 7/206.

اور جعلی الگ ہیں۔ صحاح ستہ کا سرمایہ ہے جس کا ایک ایک واقعہ تولا اور پرکھا ہوا ہے۔ مسانید ہیں جن میں سب سے ضخیم امام ابن حنبل رحمہ اللہ کی مسند ہے جو چھ جلدوں میں ہے اوران میں سے ہر جلد کی ضخامت مصر کے باریک صفحے کے ٹائپ میں پانچ پانچ سو صفحوں سے کم نہ ہوگی۔ ٭ اس میں ایک ایک صحابی کی روایتیں الگ الگ ہیں۔ ان مجموعوں میں آپ ﷺ کے حالات اور تعلیمات سب کچھ ملے جلے ہیں۔

٭ تیسرا ماخذ مغازی ہیں، یعنی وہ کتابیں جن میں زیادہ تر آپ ﷺ کے صرف غزوات اورلڑائیوں کا حال اور ضمناً اور واقعات بھی موجود ہیں۔ ان میں مغازی عروہ بن زبیر (المتوفی 94ھ)، مغازی زہری (المتوفی 124ھ)، مغازی موسیٰ بن عقبہ (المتوفی 141ھ)، مغازی ابن اسحاق (المتوفی150ھ)، مغازی زیاد بکائی (المتوفی 153ھ) اور مغازی واقدی (المتوفی 207ھ) وغیرہ قدیم ہیں۔

٭ چوتھا ماخذ عام تاریخ کی کتابیں ہیں جن کا پہلا حصہ خاص آپ ﷺ کے سوانح پر ہے۔ ان میں سب سے زیادہ معتبر اور مبسوط طبقات ابن سعد اور تاریخ الرسل والملوک امام ابوجعفر طبری، تاریخ صغیر وکبیر امام بخاری، تاریخ ابن حبان اور تاریخ ابن ابی خثیمہ بغدادی (المتوفی299ھ) وغیرہ ہیں۔

٭ نبی ﷺ کے معجزات اور روحانی کارناموں کا الگ دفتر ہے جن کو کتبِ دلائل کہتے ہیں، مثلاً: دلائل النبوۃ ابن قتیبہ (المتوفی 276ھ)، دلائل النبوۃ ابواسحاق حربی (المتوفی 255ھ)، دلائل امام بیہقی (المتوفی 458ھ) دلائل ابونعیم اصفہانی

٭ اردن کے ایک مکتبے ''بیت الأفکار'' نے ان چھ جلدوں کو تحقیق وتخریج کے ساتھ ایک ہی جلد میں جمع کر دیا ہے جو 2094 صفحات پر مشتمل ہے۔

(المتوفی 430ھ)، دلائل مستغفری (المتوفی 432ھ)، دلائل ابوالقاسم اسماعیل اصفہانی (المتوفی 535ھ) اور سب سے زیادہ مبسوط کتاب اس فن میں امام سیوطی کی خصائصِ کبریٰ ہے۔

☆ چھٹا ماخذ کتب شمائل ہیں، یعنی وہ کتابیں جو آپ ﷺ کے صرف اخلاق و عادات اور فضائل و معمولاتِ زندگی پر لکھی گئی ہیں۔ ان میں سب سے پہلی اور سب سے مشہور کتاب امام ترمذی (المتوفی279ھ) کی کتاب الشمائل ہے جس کی بڑے بڑے علماء نے بیسیوں شرحیں لکھی ہیں اور سب سے ضخیم کتاب اس فن کی الشفا فی حقوق المصطفیٰ، قاضی عیاض کی اور اس کی شرح ''نسیم الریاض'' شہاب خفاجی کی ہے۔ اسی فن کی دوسری کتابیں شمائل النبی ابو العباس مستغفری (المتوفی 432ھ) اور شمائل النور الساطع ابن المقری غرناطی (المتوفی 552ھ) اور سفر السعادۃ مجد الدین فیروز آبادی (المتوفی 817ھ) کی ہیں۔

☆ اس سے الگ وہ کتابیں ہیں جو مکہ معظّمہ اور مدینہ منورہ کے حالات میں لکھی گئی ہیں جن میں ان شہروں کے عام حالات کے علاوہ نبی ﷺ کے مقامی حالات اور ان مقامات کے نام ونشان ہیں جن کو آپ ﷺ سے کوئی تعلق ہے۔ اس قسم کی کتابوں میں سب سے قدیم اخبار مکہ ازرقی (المتوفی 223ھ) اخبارِ مدینہ عمر بن شبہ (المتوفی 262ھ)، اخبار مکہ فاکہی، اخبار مدینہ ابن زبالہ وغیرہ ہیں۔

حضرات! میں نے سیرتِ مبارکہ کے تاریخی سرمایہ کا جو نقشہ آپ کے سامنے آج کے خطبے میں پیش کیا ہے اس سے موافق اور مخالف ہر ایک کو اندازہ ہوسکتا ہے کہ سیرتِ محمدی ﷺ کی تاریخی حیثیت کیا ہے؟ صرف اس زبانی حفظ اور تحریری یادداشت

پر محدثین سلف اور خلفائے اسلام نے قناعت نہیں کی بلکہ اس فن کے اماموں کے لیے مغازی کی تعلیم کی غرض سے درس گاہوں اور مسجدوں میں حلقے قائم کیے۔ حضرت ابو قتادہ رضی اللہ عنہ انصاری صحابی تھے۔ ان کے پوتے عاصم بن عمر جو مغازی کے امام تھے اور جنھوں نے 121ھ میں وفات پائی ہے، خلیفہ عمر بن عبدالعزیز رحمہ اللہ کے حکم سے پایۂ تخت دمشق کی جامع مسجد میں بیٹھ کر اس کا درس دیتے تھے۔[1]

غرض آپ ﷺ کے عہد مبارک سے لے کر اس وقت تک ہر زمانے میں، ہر ملک میں اور ہر زبان میں آپ ﷺ کے واقعات، حالات اور ارشادات میں جو کتابیں لکھی گئیں ان کا اندازہ کئی ہزار سے زیادہ ہوگا۔ اردو کا تحریری ذخیرہ سودوسو برس سے زیادہ نہیں۔ اس میں بھی ٹھوس تصنیف کا عہد 1857ء کے پس و پیش سے شروع ہوتا ہے۔ تاہم اس وقت تک کئی سو چھوٹی بڑی کتابیں اس موضوع پر اس میں لکھی جا چکی ہیں۔

مسلمانوں کو چھوڑ کر، ان کا تو دین و ایمان ہی اس سرکار ﷺ کی عقیدت و غلامی ہے، دشمنوں کے کیمپوں میں آؤ۔ ہندوستان میں ہندوؤں نے، سکھوں نے، عیسائیوں نے، برہموں اور سماجیوں نے آپ ﷺ کی سیرتیں لکھی ہیں۔ یورپ جس کو سرور کائنات ﷺ کے ساتھ عقیدت نہیں، وہاں بھی مشنری کی خدمت کے لیے یا علمی ذوق یا تاریخ عالم کی تکمیل کے لیے لائف آف محمد ﷺ پر کتابیں لکھی گئیں۔ کئی برس قبل دمشق کے ایک علمی رسالے ''المقتبس'' میں شمارہ چھپا تھا کہ اس وقت تک یورپ کی مختلف زبانوں میں پیغمبر اسلام ﷺ کے متعلق تیرہ سو کتابیں لکھی جا چکی ہیں۔ اس کے بعد اس عہد کی اور کتابوں کو ملاؤ تو یہ شمار کہاں تک جا پہنچے گا؟

---

[1] تهذيب التهذيب:5/47.

انگریزی زبان میں پروفیسر مار گو لیوتھ (D.S.Margoliouth) جو اوکسفرڈ یونیورسٹی میں عربی زبان کے پروفیسر ہیں، کی کتاب ''محمد (ﷺ)'' سے جو 1905ء میں ہیروز آف دی نیشنز کے سلسلے میں چھپی ہے، زیادہ زہریلی کوئی کتاب سیرتِ نبوی ﷺ پر انگریزی میں نہیں لکھی گئی۔ اس میں اس شخص نے ہر واقعے کے متعلق انتہائی سند بہم پہنچا کر اس کو بگاڑ کر دکھانے میں کوئی کسر اٹھا نہیں رکھی ہے۔ تاہم وہ اپنے مقدمے میں اس حقیقت کے اعتراف سے باز نہ رہ سکا:

''محمد ﷺ کے سوانح نگاروں کا ایک طویل سلسلہ ہے جس کا ختم ہونا ناممکن ہے لیکن اس میں جگہ پانا قابل عزت ہے۔''

جان ڈیون پورٹ نے 1870ء میں انگریزی میں سب سے زیادہ ہمدردانہ کتاب ''اپالوجی فار محمد (ﷺ) اینڈ دی قرآن'' لکھی ہے۔ اس کتاب کو وہ ان الفاظ سے شروع کرتے ہیں:

''اس میں کچھ شبہ نہیں کہ تمام مقننین اور فاتحوں میں ایک بھی ایسا نہیں ہے کہ جس کے وقائع عمری محمد (ﷺ) کے وقائع عمری سے زیادہ مفصل اور سچے ہوں۔''

ریورنڈ باسورتھ اسمتھ (BASWORTH SMITH) فیلو آف ٹرینٹی کالج اوکسفرڈ نے 1874ء میں ''محمد اینڈ محمڈنزم'' کے نام سے رائل انسٹیٹیوشن آف گریٹ برٹین میں جو لیکچر دیے تھے اور جو کتاب کی صورت میں چھپے ہیں، اس میں ریورنڈ موصوف نے نہایت خوبی سے کہا ہے:

''جو کچھ عام طور سے مذہب کی (ابتدا نامعلوم ہونے کی) نسبت صحیح ہے، وہی بدقسمتی سے ان تین مذہبوں اوران کے بانیوں کی نسبت بھی صحیح ہے جن کو ہم

کسی بہتر نام موجود نہ ہونے کے سبب سے تاریخی کہتے ہیں۔ ہم مذہب کے اولین اور ابتدائی کارکنوں کی نسبت بہت کم اوران کی نسبت جنھوں نے ان کی محنتوں میں اپنی محنتیں ملائیں، شاید زیادہ جانتے ہیں۔ ہم زرتشت اور کنفیوشس کے متعلق اس سے کم جانتے ہیں جو سولن اور سقراط کے متعلق جانتے ہیں۔ موسیٰ (علیہ السلام) اور بدھ کے متعلق اس سے کم واقف ہیں جو ہم ایمبروس (AMBRASE) اور سیزر کے متعلق جانتے ہیں۔ ہم درحقیقت مسیح کی زندگی میں سے ایک ٹکڑا جانتے ہیں۔ ان تیس برسوں کی حقیقت سے کون پردہ اٹھا سکتا ہے جس نے تین سال کے لیے راستہ تیار کیا۔ جو کچھ ہم جانتے ہیں اس نے دنیا کی ایک تہائی کو زندہ کیا ہے اور شاید اور بہت زیادہ کرے۔ ایک آئیڈیل لائف جو بہت دور بھی ہے اور قریب بھی، ممکن بھی ہے اور ناممکن بھی لیکن اس کا کتنا ہی حصہ ہے جو ہم جانتے ہی نہیں۔ ہم مسیح کی ماں، مسیح کی خانگی زندگی، ان کے ابتدائی احباب، ان کے ساتھ ان کے تعلقات، ان کے روحانی مشن کے تدریجی یا یک بیک ظہور کی نسبت کیا جانتے ہیں؟ ان کی نسبت کتنے سوالات ہم میں سے ہر ایک کے ذہن میں پیدا ہوتے ہیں جو ہمیشہ سوالات ہی رہیں گے۔ لیکن اسلام میں ہر چیز ممتاز ہے۔ یہاں دھندلا پن اور راز نہیں ہے۔ ہم تاریخ رکھتے ہیں۔ ہم محمد ﷺ کے متعلق اس قدر جانتے ہیں جس قدر لیوتھر اور ملٹن کے متعلق جانتے ہیں۔ فرضی افسانے اور مافوق الفطرت واقعات ابتدائی عربی مصنفین میں نہیں یا اگر ہیں تو وہ آسانی سے تاریخی واقعات سے الگ کیے جا سکتے ہیں۔ کوئی شخص یہاں نہ خود کو دھوکا دے سکتا ہے اور نہ دوسرے کو۔

یہاں پورے دن کی روشنی ہے جو ہر چیز پر پڑ رہی ہے اور ہر ایک تک وہ پہنچ سکتی ہے۔''[1]

نبی ﷺ کی سیرت کے بیان میں مسلمانوں نے ہزاروں لاکھوں کتابیں لکھیں اور لکھ رہے ہیں اوران میں سے ہر ایک کتاب دوسرے انبیاء کی سیرتوں کے مقابلے میں زیادہ صاف، زیادہ معتبر اور زیادہ تاریخی ہے۔ سیرت و اخبار نبوی ﷺ کی ابتدائی کتابیں ہر مصنف سے سیکڑوں اور ہزاروں اشخاص نے سن کر اور پڑھ کر اوران کا ہر لفظ سمجھ کر دوسروں تک پہنچائیں۔ حدیث کی پہلی کتاب موطأ کو اس کے مصنف امام مالک رحمہ اللہ سے 600 آدمیوں نے سنا جن میں سلاطینِ زمانہ، علماء، فقہا، حکماء، ادباء اور صوفیا ہر طبقے کے آدمی تھے۔ امام بخاری رحمہ اللہ کی تصنیف جامع صحیح کوصرف ان کے ایک شاگرد فربری سے ساٹھ ہزار آدمیوں نے سنا۔ اس احتیاط میں استناد اوراس اہتمام سے بتاؤ کس شارع یا بانیِ دین کی سیرت و اخبار کا مجموعہ مرتب ہوا اور یہ تاریخی حیثیت حضرت محمد ﷺ کے سوا کس کے حصہ میں آئی؟

[1] محمد اینڈ محمڈنزم، ص: 15,14 (1889ء)۔

سیرت نبوی ﷺ انسانیت کا مکمل نمونہ

کوئی زندگی، خواہ کس قدر تاریخی ہو، جب تک وہ کامل نہ ہو ہمارے لیے نمونہ نہیں بن سکتی۔ کسی زندگی کا کامل اور ہر نقص سے پاک ہونا اس وقت تک ثابت نہیں ہوسکتا جب تک اس زندگی کے تمام اجزا ہمارے سامنے نہ ہوں۔ پیغمبر اسلام ﷺ کی زندگی کا ہر لمحہ پیدائش سے لے کر وفات تک ان کے زمانہ کے لوگوں کے سامنے تھا اور ان کی وفات کے بعد تاریخِ عالم کے سامنے ہے۔ ان کی زندگی کا کوئی مختصر سے مختصر زمانہ بھی ایسا نہیں گزرا جب وہ اہل وطن کی آنکھوں سے اوجھل ہو کر آئندہ کی تیاری میں مصروف ہوں۔

پیدائش، شیر خوارگی، بچپن، ہوش و تمیز، جوانی، تجارت، آمد و رفت، شادی، احباب قبلِ نبوت، قریش کی لڑائی اور قریش کے معاہدے میں شرکت، امین بننا اور خانہ کعبہ میں پتھر نصب کرنا، رفتہ رفتہ تنہائی پسندی، غارِ حرا کی گوشہ نشینی، وحی، اسلام کا ظہور، دعوت، تبلیغ، مخالفت، سفرِ طائف، معراج، ہجرت، غزوات، حدیبیہ کی صلح، دعوتِ اسلام کے نامہ و پیغام، اسلام کی اشاعت، تکمیل دین، حجۃ الوداع اور وفات۔ ان میں سے کون سا زمانہ ہے جو دنیا کی نگاہوں کے سامنے نہیں اور آپ ﷺ کی کون سی حالت

ہے جس سے اہل تاریخ ناواقف ہیں۔ سچ، جھوٹ، صحیح غلط، ہر چیز الگ الگ موجود ہے اوراس کو ہر شخص جان سکتا ہے۔ کبھی کبھی خیال ہوتا ہے کہ محدثین نے موضوع اور ضعیف روایتوں کو کیوں محفوظ رکھا؟ مگر خیال آیا کہ اس میں مصلحت الٰہی یہ تھی کہ معترضوں کو یہ کہنے کا موقع نہ ملے کہ ان لوگوں نے اپنے پیغمبر ﷺ کی کمزوریوں کو چھپانے کے لیے بہت سی روایتوں کو غائب کر دیا جیسا کہ آج عیسائی لٹریچر پر اعتراض کیا جاتا ہے۔ اس لیے ہمارے محدثین نے اپنے پیغمبر ﷺ کے متعلق صحیح و غلط سارا مواد سب کے سامنے لا کر رکھ دیا ہے اوران دونوں کے درمیان اختلاف بتا دیا ہے اور اصول مقرر کر دیے ہیں۔

اٹھنا بیٹھنا، سونا، جاگنا، شادی بیاہ، بال بچے، دوست احباب، نماز، روزہ، دن رات کی عبادت، صلح و جنگ، سفر وحضر، آمدورفت، نہانا دھونا، کھانا پینا، ہنسنا رونا، پہننا اوڑھنا، چلنا پھرنا، ہنسی مذاق، بولنا چالنا، خلوت جلوت، ملنا جلنا، طوروطریق، رنگ و بو، خط و خال، قدوقامت یہاں تک کہ میاں بیوی کے خانگی تعلقات اور طہارت وپاکیزگی کے واقعات ہر چیز پوری روشنی میں مذکور، معلوم اور محفوظ ہے۔ میں یہاں پر آپ کو شمائل نبوی ﷺ کی صرف ایک قدیم ترین کتاب ''شمائل ترمذی'' کے ابواب پڑھ کر سناتا ہوں جس سے آپ کو اندازہ ہوگا کہ ہمارے پیغمبر ﷺ کے معمولی سے معمولی واقعات بھی کس طرح قلم بند کیے گئے ہیں۔

- آپ ﷺ کے حلیہ اور شکل وصورت کا بیان
- آپ ﷺ کے بالوں کا بیان
- آپ ﷺ کے سفید بالوں کا بیان

آپ ﷺ کی کنگھی کا بیان

آپ ﷺ کے خضاب کا بیان

آپ ﷺ کے سرمہ لگانے کا بیان

آپ ﷺ کے لباس کا بیان

آپ ﷺ کے زندگی بسر کرنے کا بیان

آپ ﷺ کے موزوں کا بیان

آپ ﷺ کے جوتوں کا بیان

آپ ﷺ کے خاتم (انگوٹھی) کا بیان

آپ ﷺ کی تلوار کا بیان

آپ ﷺ کی زِرہ کا بیان

آپ ﷺ کے خَود کا بیان

آپ ﷺ کے عمامہ کا بیان

آپ ﷺ کے پاجامہ کا بیان

آپ ﷺ کی رفتار کا بیان

آپ ﷺ کے منہ پر کپڑا ڈالنے کا بیان

آپ ﷺ کی نشست کا بیان

آپ ﷺ کے تکیہ و بستر کا بیان

آپ ﷺ کے تکیہ لگانے کا بیان

آپ ﷺ کے کھانے کا بیان

- آپ ﷺ کی روٹی کا بیان
- آپ ﷺ کے گوشت اور سالن کا بیان
- آپ ﷺ کے وضو کرنے کا بیان
- آپ ﷺ کے کھانے کے پہلے اور بعد دعا پڑھنے کا بیان
- آپ ﷺ کے پیالے کے بارے میں
- آپ ﷺ کے پھل کے بارے میں
- آپ ﷺ کیا کیا پیتے تھے
- آپ ﷺ کیسے پیتے تھے
- آپ ﷺ کی خوشبو کا بیان
- آپ ﷺ کے باتیں کرنے کا بیان
- آپ ﷺ کے شعر پڑھنے کا بیان
- آپ ﷺ کے رات کو باتیں کرنے کا بیان
- آپ ﷺ کے قصہ کہنے کا بیان
- آپ ﷺ کے سونے کا بیان
- آپ ﷺ کی عبادت کا بیان
- آپ ﷺ کے خندہ وتبسم کا بیان
- آپ ﷺ کے مزاح کے بارے میں
- آپ ﷺ کی چاشت کی نماز کا بیان
- آپ ﷺ کے گھر میں نفل پڑھنے کا بیان

- آپ ﷺ کے روزے کا بیان
- آپ ﷺ کے قرآن پڑھنے کا بیان
- آپ ﷺ کے رونے کا بیان
- آپ ﷺ کے بستر کا بیان
- آپ ﷺ کی تواضع کا بیان
- آپ ﷺ کے اخلاق کا بیان
- آپ ﷺ کی حجامت کا بیان
- آپ ﷺ کے اسمائے گرامی کا بیان
- آپ ﷺ کی زندگی کی صورتِ حال کا بیان
- آپ ﷺ کے سن وسال وعمر کا بیان
- آپ ﷺ کی وفات کا بیان
- آپ ﷺ کی میراث ومتروکہ کا بیان

یہ آپ ﷺ کے تمام ذاتی حالات ہیں۔ ان میں سے ہر ایک عنوان کے متعلق کہیں چند، کہیں بکثرت واقعات ہیں اوران میں سے ہر پہلو صاف اور روشن ہے۔ نبی ﷺ کی زندگی کا کوئی لمحہ پردے میں نہ تھا۔ اندر آپ بیویوں اور بال بچوں کے مجمع میں ہوتے تھے، باہر معتقدوں اور دوستوں کی محفل میں۔

بڑے سے بڑا آدمی بھی اپنے گھر میں معمولی آدمی ہوتا ہے۔ اسی لیے والٹیر کے مشہور فقرے کے مطابق (No man is a hero to his valet) ''کوئی شخص اپنے گھر کا ہیرو نہیں ہوسکتا۔'' باسورتھ اسمتھ کی رائے میں کم از کم یہ اصول پیغمبر اسلام ﷺ کے

متعلق صحیح نہیں۔[1]

گبن نے لکھا ہے کہ ''تمام پیغمبروں میں سے کسی نے اپنے پیروؤں کا اس قدر سخت امتحان نہیں لیا جس قدر محمد ﷺ نے۔ انھوں نے دفعتاً اپنے کو سب سے پہلے ان لوگوں کے سامنے بحیثیت پیغمبر کے پیش کیا جو ان کو بحیثیت انسان کے بہت اچھی طرح جانتے تھے۔ اپنی بیوی، اپنے غلام، اپنے چچا زاد بھائی، اپنے سب سے واقف کار دوست کے سامنے اور ان سب نے بلا پس و پیش آپ کے دعوے کی صداقت کو تسلیم کر لیا۔''

بیوی سے بڑھ کر انسان کی اندرونی کمزوریوں کا واقف کار کوئی دوسرا نہیں ہوسکتا۔ مگر کیا یہ واقعہ نہیں ہے کہ آپ ﷺ کی صداقت پر سب سے پہلے آپ کی بیوی ایمان لائیں۔ وہ نبوت سے پہلے پندرہ برس تک آپ کی رفاقت میں رہ چکی تھیں اور آپ کے ہر حال اور ہر کیفیت کی نسبت ذاتی واقفیت رکھتی تھیں۔ جب آپ ﷺ نے پیغمبری کا دعویٰ کیا تو سب سے پہلے انھی نے اس دعوے کی سچائی کو تسلیم کیا۔

بڑے سے بڑا انسان جو ایک ہی بیوی کا شوہر ہو، وہ بھی یہ ہمت نہیں کر سکتا کہ وہ اس کو یہ اذنِ عام دے کہ تم میری ہر بات، ہر حالت اور ہر واقعے کو برملا کہہ دو اور جو کچھ چھپا ہے وہ سب پر ظاہر کر دو۔ مگر آپ ﷺ کی بیک وقت نو بیویاں تھیں اور ان میں سے ہر ایک کو یہ اذنِ عام تھا کہ خلوت میں مجھ میں جو کچھ دیکھو وہ جلوت میں سب سے برملا بیان کر دو۔ جو رات کی تاریکی میں دیکھو وہ دن کی روشنی میں ظاہر کر دو۔ جو بند کوٹھڑیوں میں دیکھو اس کو کھلی چھتوں پر پکار کر کہہ دو۔ اس اخلاقی وثوق و اعتماد کی مثال کہیں اور مل سکتی ہے؟

[1] لائف آف محمد پر خطبات، ص: 105.

یہ تو نبی ﷺ کے ذاتی احوال کے متعلق تھا۔ آپ ﷺ کے اخلاقِ طاہرہ اور اعلی اوصاف کے بیان و تفصیل سے احادیث کی تمام کتابیں بھری پڑی ہیں۔ خصوصیت کے ساتھ قاضی عیاض اندلسی کی کتاب ''الشفا'' اس پہلو سے بہترین کتاب ہے۔ ایک یورپین مستشرق نے فرانس میں مجھ سے کہا تھا کہ پیغمبر اسلام ﷺ کے اصلی محاسن سے واقف کرنے کے لیے یہ کافی ہے کہ قاضی عیاض کی ''الشفا'' کا کسی یورپین زبان میں ترجمہ کر دیا جائے۔

سیرت نبوی ﷺ کے حوالے سے ہم نے شمائل کے تحت یہ ابواب قائم کیے ہیں:

شمائل نبوی ﷺ کے عنوانات

حلیۂ اقدس، مہر نبوت، موئے مبارک، رفتار، گفتار، خندہ و تبسم، لباس، انگوٹھی، خَود وزِرہ، غذا اور طریقۂ طعام، معمولاتِ طعام، خوش لباسی، مرغوب رنگ، نامرغوب رنگ، خوشبو کا استعمال، لطافت پسندی اور سواری کا شوق۔

معمولات نبوی ﷺ کے عنوانات

صبح سے شام تک کے معمولات، خواب، عبادت شبانہ، معمولات نماز، معمولات خطبہ، معمولات سفر، معمولات جہاد، معمولات عیادت و عزا، معمولاتِ ملاقات اور عام معمولات۔

مجلس نبوی ﷺ کے عنوانات

دربارِ نبوت، مجالسِ ارشاد، آداب مجالس، اوقاتِ مجلس، عورتوں کے لیے مخصوص مجالس، طریقۂ ارشاد، مجالس میں شگفتگی، فیضِ صحبت، طرزِ بیان، خطبات کی نوعیت،

خطبات نبوی ﷺ کی تاثیر۔

عبادات کے عنوانات

دعا اور نماز، روزہ، زکاۃ، حج، صدقہ، ہمیشہ یادِ الٰہی، اللہ تعالیٰ کا ذوق وشوق، میدانِ جنگ میں یادِ الٰہی، خشیتِ الٰہی، گریہ، محبت الٰہی، اللہ پر توکل، صبر وشکر۔

اخلاقِ نبوی ﷺ کی تفصیلی جزئیات

اخلاق نبوی ﷺ کا جامع بیان، استقامتِ عمل، حسنِ اخلاق، حسنِ معاملہ، عدل وانصاف، جودوسخا، ایثار، مہمان نوازی، گداگری سے نفرت، صدقہ سے پرہیز، تحفے قبول کرنا، کسی کا احسان نہ قبول کرنا، عدمِ تشدد، عیب جوئی اور مداحی کی ناپسندیدگی، سادگی اور بے تکلفی، امارت پسندی اور دکھاوے سے پرہیز، مساوات، تواضع، بے جا تعظیم اور مدح کی ناپسندیدگی، شرم و حیا، اپنے ہاتھ سے کام کرنا، عزم و استقلال، شجاعت، راست گفتاری، ایفائے عہد، زہدو قناعت، عفووحلم، دشمنوں سے عفوو درگزر اور حسنِ سلوک، کفار اور مشرکین سے برتاؤ، یہود و نصاریٰ کے ساتھ برتاؤ، غریبوں کے ساتھ محبت و شفقت، دشمنانِ جانی سے عفو و درگزر، دشمنوں کے حق میں دعائے خیر، بچوں پر شفقت، خواتین کے ساتھ برتاؤ، حیوانات پر رحم، رحمت ومحبتِ عام، رقیق القلبی، عیادت وتعزیت، لطفِ طبع، اولاد سے محبت، ازواجِ مطہرات کے ساتھ سلوک۔

نبیِ اکرم ﷺ کے ذاتی حالات کی فہرست

حافظ ابن قیم نے ''زاد المعاد'' میں سب سے زیادہ آپ ﷺ کے حالات کا احاطہ

کیا ہے، چنانچہ صرف ذاتی حالات کی فہرست سنیے:

نبی ﷺ کا طریقہ رسل ورسائل، آپ ﷺ کے کھانے پینے کا طریقہ، آپ ﷺ کے نکاح اور ازدواجی تعلقات کا طریقہ، خواب و بیداری کا طریقہ، سواری کا طریقہ، لونڈی اور غلام کو اپنی خدمت کے لیے قبول فرمانے کا طریقہ، آپ ﷺ کے معاملات اور خرید و فروخت کا طریقہ، اہم ضروریات کے آداب، اصلاح اور خط بنوانے کا طریقہ، مونچھوں کے رکھنے اور ترشوانے میں آپ ﷺ کا طریقہ، آپ ﷺ کا طرزِ کلام، آپ ﷺ کی خاموشی، آپ ﷺ کا تبسم فرمانا، آپ ﷺ کا رونا، آپ ﷺ کا طریقہ خطابت، طریقہ وضو، موزوں پر مسح کرنے کا طریقہ، طریقہ تیمّم، آپ ﷺ کے نماز ادا کرنے کا طریقہ، آپ ﷺ کا دو سجدوں کے درمیان بیٹھنے کا طریقہ، آپ ﷺ کے سجدہ کرنے کا طریقہ، قعدۂ اخیر میں آپ ﷺ کی نشست کی کیفیت، آپ ﷺ کے نماز میں بیٹھنے اور تشہد کے وقت انگلی اٹھانے کا طریقہ، آپ ﷺ کے نماز میں سلام پھیرنے کا طریقہ، نماز میں آپ ﷺ کا دعا فرمانا، آپ ﷺ کے سجدۂ سہو کرنے کا طریقہ، آپ ﷺ کے نماز میں سترہ کھڑا کرنے کا طریقہ، سفر و حضر، مسجد اور گھر میں آپ ﷺ کے سنن و نوافل پڑھنے کا طریقہ، تہجد یا فجر کی سنتوں کے بعد آپ ﷺ کی استراحت کا طریقہ، آپ ﷺ کے تہجد پڑھنے کا طریقہ، رات کی نماز اور وتر پڑھنے کا طریقہ، آپ ﷺ کے قرآن پڑھنے کی کیفیت، آپ ﷺ کی استراحت کا طریقہ، آپ ﷺ کی چاشت کی نماز پڑھنے کا طریقہ، آپ ﷺ کے سجدۂ شکر بجا لانے کا طریقہ، آپ ﷺ کے سجدۂ تلاوت ادا کرنے کا طریقہ، آپ ﷺ کے جمعہ کے دن کی عبادت کا طریقہ، آپ ﷺ کے جمعہ کے دن خطبہ دینے کا طریقہ، نمازِ عیدین میں

آپ ﷺ کا طریقہ، سورج گرہن کے وقت آپ ﷺ کے نماز پڑھنے کا طریقہ، نمازِ استسقاء میں آپ ﷺ کا طریقہ، آپ ﷺ کے سفر کا طریقہ، سفر میں آپ ﷺ کے نفل پڑھنے کا طریقہ، آپ ﷺ کے دو نمازوں کو اکٹھی پڑھنے کا طریقہ، آپ ﷺ کے قرآن پڑھنے اور سننے کا طریقہ، بیماروں کی عیادت میں آپ ﷺ کا طریقہ، جنازوں کے ساتھ آپ ﷺ کے تیز قدم اٹھانے کا طریقہ، آپ ﷺ کا میت پر کپڑا ڈالنے کا طریقہ، کسی میت کے آنے پر اس کے متعلق آپ ﷺ کے سوال کرنے کا طریقہ، جنازے کی نماز میں آپ ﷺ کا طریقہ، چھوٹے بچوں پر نمازِ جنازہ پڑھنے میں آپ ﷺ کا معمول، خودکشی کرنے والے اور جہاد کے مالِ غنیمت میں خیانت کرنے والے پر آپ ﷺ کا نماز نہ پڑھنا، جنازے کے آگے آگے آپ ﷺ کے چلنے کا طریقہ، جنازۂ غائب پر آپ ﷺ کے نماز پڑھنے کا طریقہ، جنازے کے لیے آپ ﷺ کے کھڑے ہونے کا طریقہ، تعزیت اور زیارتِ قبور میں آپ ﷺ کا طریقہ، نمازِ خوف میں آپ ﷺ کا طریقہ، زکاۃ و صدقات میں آپ ﷺ کا طریقہ، روزے میں آپ ﷺ کا طریقہ، رمضان میں زیادہ عبادت کرنے کا طریقہ، چاند دیکھنے کے ساتھ ہی روزہ و افطار کے متعلق آپ ﷺ کا طریقہ، عرفہ کے دن عرفہ کی وجہ سے افطار فرمانے اور جمعہ، ہفتہ اور اتوار میں آپ ﷺ کے روزہ رکھنے کا طریقہ، آپ ﷺ کے پے در پے روزہ رکھنے کا طریقہ، آپ ﷺ کے نفل روزہ رکھنے اور اس کے ٹوٹ جانے پر ادا کرنے کو واجب نہ سمجھنے کا طریقہ، جمعہ کے دن کو روزہ کے لیے مخصوص کر لینے پر آپ ﷺ کا کراہت فرمانا، آپ ﷺ کے اعتکاف کا طریقہ، حج وعمرہ میں آپ ﷺ کا طریقہ، آپ ﷺ کا ایک سال میں دو عمرے ادا کرنے کا

طریقہ، آپ ﷺ کے حج کی کیفیت، آپ ﷺ کا حج میں اپنے دستِ مبارک سے قربانی فرمانے کا طریقہ، آپ ﷺ کا حج میں سر منڈانے کا طریقہ، ایام حج میں آپ ﷺ کے خطبوں کا طریقہ، عیدالاضحیٰ میں آپ ﷺ کے قربانی کرنے کا طریقہ، عقیقہ میں آپ ﷺ کا طریقہ، نومولود بچے کے کان میں آپ ﷺ کے اذان دینے، اس کا نام رکھنے اوراس کا ختنہ کرنے میں آپ ﷺ کی عادات، ناموں اور کنیتوں کے رکھنے میں آپ ﷺ کا طریقہ، بولنے میں احتیاط اور الفاظ کے انتخاب میں آپ ﷺ کا طریقہ، اذکار و وظائف میں آپ ﷺ کا طریقہ، آپ ﷺ کا گھر میں داخلے کا طریقہ، بیت الخلا جانے اور وہاں سے واپس آنے کا طریقہ، آپ ﷺ کے کپڑا پہننے کا طریقہ، وضو کی دعا کے متعلق آپ ﷺ کا طریقہ، اذان کے وقت اذان کے الفاظ دُہرانے کے متعلق آپ ﷺ کا طریقہ، رؤیت ہلال کے وقت آپ ﷺ کے دعا فرمانے کا طریقہ، کھانے سے پہلے اوراس کے بعد آپ ﷺ کے دعاؤں کے پڑھنے کا طریقہ، آدابِ طعام میں آپ ﷺ کا طریقہ، آدابِ سلام میں آپ ﷺ کا طریقہ، آپ ﷺ کا دوسروں کے گھر میں اجازت مانگ کر داخل ہونے کا طریقہ، آدابِ سفر میں آپ ﷺ کے طریقے اور سفر میں دعاؤں کے پڑھنے کا طریقہ، نکاح کی دعاؤں کے متعلق آپ ﷺ کا طریقہ، بعض الفاظ کے استعمال کو مکروہ سمجھنے میں آپ ﷺ کی عادت، غزوات اور جہاد میں آپ ﷺ کا طریقہ، قیدیوں کے متعلق آپ ﷺ کا معمول، قیدی، جاسوس اور غلام کے متعلق آپ ﷺ کا معمول، صلح کرنے، امان دینے، جزیہ مقرر کرنے اوراہل کتاب ومنافقین کے ساتھ معاملات کرنے میں آپ ﷺ کا طریقہ، کفار و منافقین کے ساتھ علی الترتیب آپ ﷺ کے برتاؤ

کرنے کا طریقہ، آپ ﷺ کا امراضِ قلب اور امراضِ بدن کا علاج کرنے کا طریقہ۔
میں نے آپ کے سامنے معمولی سے معمولی باتوں کی اجمالی فہرست پیش کی ہے۔ اس سے آپ یہ اندازہ لگا سکتے ہیں کہ جب ان چھوٹی چھوٹی باتوں کو محفوظ رکھا گیا ہے تو بڑی بڑی اہم باتوں کی کیا کچھ تفصیل موجود نہ ہوگی؟ غرض ایک انسان کی زندگی کے جس قدر پہلو ہو سکتے ہیں وہ سب محفوظ ہیں۔

اب آپ نے سمجھا ہوگا کہ مکمل شخصیت سے میرا کیا مقصود تھا اور میرے اس دعوے کی (کہ اس معیار پر سیرت محمدی ﷺ کے سوا انبیاء علیہم السلام میں سے کسی کی سیرت محفوظ نہیں) صداقت آشکارا ہوگئی ہوگی۔

نبی ﷺ، خواہ خلوت میں ہوں یا جلوت میں، مسجد میں ہوں یا میدانِ جہاد میں، نمازِ شبانہ میں مصروف ہوں یا فوجوں کی درستی میں، منبر پر ہوں یا گوشۂ تنہائی میں، ہر وقت اور ہر شخص کو حکم تھا کہ جو کچھ میری حالت اور کیفیت دیکھو وہ سب منظر عام پر لائی جائے۔

ازواجِ مطہرات آپ ﷺ کے خلوت خانوں کے حالات سنانے اور بتانے میں مصروف رہیں۔ مسجد نبوی ﷺ میں ایک چبوترہ ان عقیدت مندوں کے لیے تھا جن کے رہنے کے لیے گھر نہ تھے۔ وہ باری باری سے دن کو جنگل سے لکڑیاں کاٹ کر لاتے اور اس سے روزی حاصل کرتے اور سارا وقت آپ ﷺ کے ارشادات سنتے۔ آپ ﷺ کے حالات دیکھنے اور آپ ﷺ کی معیت میں گزارنے کے لیے صرف کرتے تھے۔ ان کی تعداد ستر کے قریب تھی۔ انھی میں حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ بھی تھے جن سے زیادہ کسی صحابی کی روایات نہیں۔ یہ ہستیاں معتقد جاسوسوں کی طرح شب و روز،

ذوق وشوق سے آپ ﷺ کے حالات دیکھنے اور دوسروں کو بیان کرنے میں مصروف رہتی تھیں۔ دن میں پانچ مرتبہ مدینہ میں رہنے والی تمام آبادی دس برس تک مسلسل آپ ﷺ کی ایک ایک حرکت وسکون اور ایک ایک جنبش کو دیکھتی رہی۔

غزوات اور لڑائیوں کے موقع پر ہزار ہا صحابہ رضی اللہ عنہم کوشب و روز آپ کو دیکھنے اور آپ کے حالاتِ مبارکہ سے واقف ہونے کا موقع ملتا تھا۔ غزوۂ فتح مکہ میں 10 ہزار، تبوک میں 30 ہزار اور حجۃ الوداع میں تقریباً ایک لاکھ صحابہ رضی اللہ عنہم کو آپ کی زیارت کے موقعے ملتے رہے اور خلوت وجلوت، گھر اور باہر، صفہ اور مسجد، حلقۂ تعلیم اور میدانِ جنگ تک میں جس نے جس حال میں آپ ﷺ کو دیکھا اس کی عام اشاعت کی۔ نہ صرف اس کو اجازت بلکہ حکم اور تاکید تھی۔

اب آپ سمجھ سکتے ہیں کہ آپ ﷺ کی زندگی کا کون سا پہلو ہوگا جو زیر پردہ رہا ہوگا اور اس پر بھی ایک شخص بھی آپ ﷺ پر عیب چینی نہ کرسکا۔ آج بھی آپ ﷺ کے دشمن اور مخالف پوری چھان بین اور تلاش وجستجو کے بعد مسئلۂ جہاد اور تعددِ ازدواج کے سوا آپ ﷺ پر کوئی بھی اعتراض نہ کرسکے تو اب ایسی زندگی کو معصوم اور بے گناہ کہنا زیبا ہے یا ان زندگیوں کو جن کا بڑا حصہ ہماری نگاہوں سے اوجھل اور پوشیدہ ہے۔

ایک حیثیت سے اور غور فرمایئے! نبی ﷺ ہمیشہ صرف اپنے معتقدوں ہی کے حلقے میں نہیں رہے بلکہ مکہ میں قریش کے مجمع میں رہے۔ نبوت سے پہلے چالیس برس آپ کی زندگی انھی کے ساتھ گزری اور پھر تاجرانہ زندگی، لین دین کی زندگی، معاملہ اور کاروبار کی زندگی جس میں قدم قدم پر بدمعاملگی، بدنیتی، وعدہ خلافی اور خیانت کاری

کے گھرے غار آتے ہیں۔ مگر آپ ﷺ اس طرح بے خطر اس راستے سے گزر گئے کہ آپ ﷺ کو ان سے امین کا خطاب حاصل ہوا۔ نبوت کے بعد بھی لوگوں کو آپ ﷺ پر یہ اعتماد تھا کہ امانتیں آپ ﷺ ہی کے پاس رکھواتے تھے، چنانچہ ہجرت کے موقع پر حضرت علی رضی اللہ عنہ کو اسی لیے مکہ میں چھوڑا کہ آپ کے بعد وہ لوگوں کی امانتیں واپس کر سکیں۔ آپ ﷺ کے دعوائے نبوت پر تمام قریش نے برہمی ظاہر کی، مقاطعہ کیا، دشمنیاں ظاہر کیں، گالیاں دیں، راستے روکے، نجاستیں ڈالیں، پتھر پھینکے، قتل کی سازشیں کیں، آپ کو جادوگر کہا، شاعر کہا، مجنون کہا مگر کسی نے یہ جرأت نہ کی کہ آپ کے اخلاق اور اعمال کے خلاف ایک حرف بھی زبان سے نکال سکے، حالانکہ نبوت اور پیغمبری کے دعوے ہی کے یہ معنی ہیں کہ مدعی اپنی بے گناہی اور معصومیت کا دعویٰ کر رہا ہے۔ اس دعوے کے رَد کے لیے آپ ﷺ کے اخلاق و اعمال کے متعلق چند مخالفانہ شہادتیں بھی کافی تھیں۔ تاہم اس دعوے کے توڑنے کے لیے انھوں نے اپنی دولت لوٹائی، اپنی اولاد کو قربان کیا، اپنی جانیں دیں۔ لیکن یہ ممکن نہ ہوا کہ وہ آپ کی ذات پر معمولی اعتراض کر کے بھی اس کو باطل کر سکیں۔

کیا اس سے یہ ثابت نہیں ہوتا کہ جو آپ دوستوں کی نظر میں تھے وہی دشمنوں کی نگاہ میں بھی تھے اور کوئی بھی چیز در پردہ اور نا معلوم نہ تھی۔

ایک روز قریش کے بڑے بڑے رئیس جلسہ جمائے بیٹھے تھے اور آپ ﷺ کا ذکر ہو رہا تھا۔ نضر بن حارث نے جو قریش میں سب سے زیادہ جہاندیدہ تھا، کہا کہ ''اے قریش! تم پر جو مصیبت آئی ہے تم اس کی کوئی تدبیر نہ نکال سکے۔ محمد (ﷺ) تمھارے سامنے بچے سے جوان ہوا، وہ تم میں سب سے زیادہ سچا، امانت دار اور پسندیدہ تھا

اوراب جبکہ اس کے بالوں میں سفیدی آچکی اور تمھارے سامنے یہ باتیں پیش کیں تو تم کہتے ہو کہ وہ جادوگر ہے۔ غیب جاننے والا ہے، شاعر ہے، مجنون ہے۔ اللہ کی قسم! میں نے اس کی باتیں سنی ہیں، محمد (ﷺ) میں یہ بات کوئی نہیں۔ ①

نبی ﷺ کا سب سے بڑا دشمن ابوجہل کہا کرتا تھا کہ محمد (ﷺ)! میں تم کو جھوٹا نہیں کہتا، البتہ تم جو کچھ کہتے اور سمجھاتے ہو اس کو صحیح نہیں سمجھتا، چنانچہ قرآن مجید کی یہ آیت اسی موقع پر نازل ہوئی:

﴿قَدْ نَعْلَمُ اِنَّهٗ لَيَحْزُنُكَ الَّذِيْ يَقُوْلُوْنَ فَاِنَّهُمْ لَا يُكَذِّبُوْنَكَ وَلٰكِنَّ الظّٰلِمِيْنَ بِاٰيٰتِ اللّٰهِ يَجْحَدُوْنَ ۝﴾

''بے شک ہم جانتے ہیں کہ بلاشبہ حقیقت یہ ہے کہ یقیناً آپ کو وہ بات غمگین کرتی ہے جو وہ کہتے ہیں۔ تو بلاشبہ وہ آپ کو نہیں جھٹلاتے اور لیکن وہ ظالم اللہ کی آیات ہی کا انکار کرتے ہیں۔'' ②

جب نبی ﷺ کو بارگاہِ الٰہی سے حکم ہوا کہ اپنے خاندان کے لوگوں کو اسلام کی دعوت دو تو آپ ﷺ نے ایک پہاڑ پر چڑھ کر پکارا: ''يَا مَعْشَرَ قُرَيْش!'' جب سب لوگ جمع ہو گئے تو فرمایا: ''اگر میں تم سے یہ کہوں کہ پہاڑ کے پیچھے سے ایک لشکر آرہا ہے کیا تم کو یقین آئے گا؟'' سب نے کہا: ہاں! کیونکہ ہم نے تم کو کبھی جھوٹ بولتے نہیں دیکھا۔ ③

قیصر روم کے دربار میں قاصدِ نبوی پہنچا ہے، کفارِ قریش میں سے آپ ﷺ کے سب سے بڑے حریف اور مقابل ابوسفیان جو چھ برس متواتر آپ کے مقابلے میں

① سيرة ابن هشام:336/1. ② الأنعام33:6. ③صحيح البخاري، حديث:4971 .

فوجوں کے پرے جماتے رہے، وہ آپ ﷺ کی تصدیقِ حال اور تفتیش کے لیے بلائے جاتے ہیں۔موقع کی نزاکت پر غور کرو، ایک دشمن کی شہادت اپنے ایک ایسے دشمن کے حق میں ہے جس کو وہ دل سے مٹا دینا چاہتا ہے، ایک ایسے باسروسامان بادشاہ کے دربار میں اس کی شہادت ہے کہ اگر اس کو راضی کرلیا جائے تو دم کے دم میں اس کی فوجیں مدینے کی سمت بڑھ سکتی تھیں۔تاہم اس سوال و جواب کو سنیے:

قیصر : مدعیِ نبوت کا خاندان کیسا ہے؟

ابوسفیان : شریف ہے۔

قیصر : اس خاندان میں کسی اور نے بھی نبوت کا دعویٰ کیا ہے؟

ابوسفیان : نہیں۔

قیصر : اس خاندان میں کوئی بادشاہ گزرا ہے؟

ابوسفیان : نہیں۔

قیصر : جن لوگوں نے اس کے مذہب کو قبول کیا ہے، وہ کمزور ہیں یا صاحب اثر؟

ابوسفیان : کمزور لوگ ہیں۔

قیصر : اس کے پیرو بڑھ رہے ہیں یا گھٹتے جاتے ہیں؟

ابوسفیان : بڑھتے جاتے ہیں۔

قیصر : کبھی تم لوگوں کو اس کی نسبت جھوٹ کا بھی تجربہ ہوا ہے؟

ابوسفیان : نہیں۔

قیصر : وہ کبھی اپنے عہد و قرار سے بھی پھرا ہے؟

ابوسفیان : ابھی تک تو نہیں مگر آیندہ دیکھیں۔

قیصر : وہ کیا سکھاتا ہے؟

ابوسفیان : کہتا ہے کہ ایک اللہ کی عبادت کرو، نماز پڑھو، پاکدامنی اختیار کرو، سچ بولو اور اہل قرابت کا حق ادا کرو۔[1]

کیا اس سے زیادہ نازک موقع کی شہادت سوائے سیرت محمدی ﷺ کے اور کہیں دستیاب ہوسکتی ہے؟ اس سے زیادہ آپ ﷺ کے اکمل ہونے کی کیا دلیل ہوسکتی ہے؟ ایک نکتے کی طرف آپ کی توجہ دلانا چاہتا ہوں۔ آپ ﷺ پر جو لوگ ابتدا میں ایمان لائے وہ دریا کے کنارے کے ماہی گیر نہ تھے۔ وہ مصر کی محکوم اور غلام قوم کے افراد نہ تھے بلکہ ایک ایسی آزاد قوم کے افراد تھے جو اپنی عقل و دانش کے لحاظ سے ممتاز تھی اور جس نے ابتدائے آفرینش سے آج تک کبھی کسی کی اطاعت قبول نہیں کی تھی۔ وہ لوگ تھے جن کے تجارتی کاروبار، ایران، شام، مصر اور ایشائے کوچک تک پھیلے ہوئے تھے۔ ان میں وہ لوگ بھی تھے جن کی نکتہ رسی اور عقل و ذہانت کے ثبوت، مسائل اور احکام کی صورت میں آج بھی موجود ہیں۔ ان میں وہ لوگ بھی تھے جنھوں نے بڑی بڑی فوجوں کا فاتحانہ مقابلہ کیا اور دنیا کے مشہور سپہ سالاروں میں داخل ہیں۔ ان میں وہ لوگ بھی تھے جنھوں نے ملکوں پر فرماں روائیاں کیں اور حکومت کے نظم ونسق کی بہترین قابلیت کا اظہار کیا۔ کیا ایک لمحے کے لیے بھی کوئی یہ تصور کر سکتا ہے کہ ایسے پرزور اور قوی بازو سے آپ ﷺ کا کوئی حال چھپا رہ سکتا تھا اور وہ دھوکا کھا سکتے تھے؟ بلکہ یہی وہ لوگ ہیں جنھوں نے آپ ﷺ کی ایک ایک جنبش کی نقل کی

[1] صحيح البخاري، حديث: 7.

ہے اور آپ ﷺ کے ایک ایک نقش قدم پر چلنا اپنی سعادت سمجھتے تھے۔ یہ آپ ﷺ کے کامل ہونے کی ناقابل تردید دلیل ہے۔

نبی ﷺ نے اپنے حالات و واقعات پر کبھی کوئی پردہ ڈالنے کی کوشش نہیں کی۔ آپ ﷺ جس طرح تھے اسی طرح سب کو معلوم تھے اور اسی طرح اب تک ہیں۔ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا آپ کی زوجۂ محترمہ جو نو برس تک آپ کے ساتھ رہیں، فرماتی ہیں کہ ''جو تم سے یہ بیان کرے کہ محمد ﷺ نے اللہ کے احکام سے کچھ چھپا لیا ہے اور مخلوق پر ظاہر نہیں کیا تو اس کو سچ نہ ماننا کیونکہ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے:

﴿يَاأَيُّهَا الرَّسُولُ بَلِّغْ مَآ أُنْزِلَ إِلَيْكَ مِنْ رَّبِّكَ ۚ وَإِنْ لَّمْ تَفْعَلْ فَمَا بَلَّغْتَ رِسَالَتَهُ﴾

''اے رسول! پہنچا دیں جو کچھ آپ کے رب کی طرف سے آپ پر نازل کیا گیا ہے اور اگر آپ نے ایسا نہ کیا تو آپ نے اس کا پیغام نہیں پہنچایا۔''[1]

دنیا میں کوئی شخص نہیں چاہتا کہ اپنی ادنیٰ سے ادنیٰ کمزوری کا بھی بے خطر برملا اعلان کر دے۔ خصوصاً وہ جو ایک جماعت کی رہبری و رہنمائی اور وہ بھی روحانی و اخلاقی کر رہا ہو، لیکن قرآن مجید میں متعدد آیتیں ایسی ہیں جن میں آپ ﷺ کی ظاہری لغزشوں کا ذکر کیا گیا ہے تاہم ان میں سے ہر آیت آپ نے پڑھ کر سنائی۔ لوگوں نے یاد کی، ہر محراب و مسجد میں پڑھی گئی اور اب تک جہاں محمد ﷺ کا نام ہے وہ آیتیں ان کے ماننے والوں کی زبانوں پر ہیں، حالانکہ اگر ان معمولی فروگزاشتوں کا قرآن مجید میں ذکر نہ ہوتا تو آج دنیا کو ان کا علم بھی نہ ہوتا مگر ایک پاک زندگی کی ہر

[1] المآئدة5:67، صحيح البخاري، حديث:4612.

چیز روشن ہونا تھی اور وہ کی گئی۔

نبی ﷺ کا اپنے منہ بولے بیٹے کی بیوی سے نکاح کرنا جہلائے عرب کے نزدیک قابلِ اعتراض تھا۔ اس واقعہ کا ذکر قرآن مجید میں وضاحت سے موجود ہے۔ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا فرماتی ہیں کہ اگر نبی ﷺ اللہ کی کسی وحی کو چھپا سکتے تو ان آیات کو ضرور چھپا دیتے (جن میں اس نکاح کا تذکرہ ہے۔)[1] تاکہ جاہلوں کو اعتراض کا موقع نہ ملے۔ مگر آپ ﷺ نے ایسا نہ کیا۔ اس سے ثابت ہوتا ہے کہ آپ ﷺ کی زندگی کا کوئی پہلو تاریک نہیں رہا۔

باسورتھ اسمتھ صاحب کی یہ شہادت پیش کرنے کے لائق ہے:

''یہاں پورے دن کی روشنی ہے جو ہر چیز پر پڑ رہی ہے اور ہر ایک تک وہ پہنچ سکتی ہے۔ شخصیت کی تاریک گہرائیاں درحقیقت ہیں اور ہماری پہنچ کے خط سے باہر وہ ہمیشہ رہیں گی، لیکن ہم محمد ﷺ کی بیرونی تاریخ کی ہر چیز جانتے ہیں۔ ان کی جوانی، ان کا ظہور، ان کے تعلقات، ان کی عادات، ان کا پہلا تخیل اور تدریجی ترقی، ان کی عظیم الشان وحی کا باری باری آنا اور ان کی اندرونی تاریخ کے لیے اس کے بعد کہ ان کے مشن کا اعلان کیا جا چکا، ہم ایک کتاب (قرآن) رکھتے ہیں جو اپنی اصلیت میں، اپنے محفوظ رہنے میں، اپنے مضامین کی بے ترتیبی میں بالکل یکتا ہے۔ لیکن اس کی جوہری صداقت میں کوئی شخص کبھی سنجیدہ شک نہ کر سکا۔ اگر کوئی کتاب ہم ایسی رکھتے ہیں جو اپنے زمانے کے ماسٹر سپرٹ کا آئینہ ہو تو یہ کتاب ہے۔ عموماً بناوٹ سے پاک،

[1] مسند أحمد: 241/6.

غیر مرتب، متضاد، تھکا دینے والی لیکن چند عظیم الشان خیالات سے معمور، ایک دماغ جو اس روحانیت سے لبریز، جو اس کے اندر بند ہے۔ اللہ کے نشے میں مست و سرشار لیکن انسانی کمزوریوں کے ساتھ جن سے پاک ہونے کا کبھی انھوں نے دعویٰ نہیں کیا اور یہ محمد (ﷺ) کی آخری عظمت ہے کہ انھوں نے ان سے پاک ہونے کا دعویٰ نہیں کیا۔''

گبن کے الفاظ ہیں:

''کسی ابتدائی پیغمبر نے کبھی صداقت کا کوئی ایسا سخت امتحان پاس نہیں کیا جیسا کہ محمد ﷺ نے، جبکہ اس نے پہلے پہل اپنے کو بحیثیت پیغمبر کے ان لوگوں کے سامنے پیش کیا جو اس کی کمزوریوں سے بحیثیت ایک انسان ہونے کے واقف تھے۔ وہ لوگ جو اس سے سب سے زیادہ واقف تھے، ان کی بیوی، ان کا ذاتی غلام، ان کا چچا زاد بھائی، ان کا سب سے پرانا دوست جس نے جیسا کہ محمد (ﷺ) نے خود کہا ہے کہ اس کے پیروؤں میں وہی ایک ہے جس نے نہ پشت پھیری اور نہ گھبرایا۔ یہی لوگ اس کے سب سے پہلے معتقد ہوئے۔ پیغمبروں کی عام قسمت محمد ﷺ کے حق میں الٹ گئی۔ وہ غیر معزز نہ تھا لیکن ان کے نزدیک جو اس سے واقف نہ تھے۔''

ان شہادتوں کا مطلب یہ ہے کہ جو جس قدر آپ ﷺ کے حالات سے واقف تھا، اسی قدر زیادہ وہ ان کا عقیدت مند تھا۔ عام پیغمبروں کا یہ اصول رہا ہے کہ پہلے ان کو ناواقفوں نے مانا ہے، تب جا کر گھر والوں کی باری آئی ہے۔ مگر آپ ﷺ کا معاملہ اس سے بالکل مختلف ہے۔ آپ کو سب سے پہلے انھوں نے مانا جو آپ ﷺ کے

اخلاق، عادات اور حالات سے زیادہ واقف تھے اور ان میں سے ہر ایک نے اپنے اپنے ایمان و اعتقاد کا شدید خطرناک امتحان دیا ہے۔ حضرت خدیجہ رضی اللہ عنہا تین برس تک آپ ﷺ کے ساتھ شعبِ ابی طالب میں محصور رہیں جس میں بھوک اور فقر و فاقہ سے دوچار ہونا پڑا۔ حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ نے اس وقت جب ہر چہار طرف دشمن تعاقب میں تھے، رات کی تاریکی میں آپ کے ساتھ خطرناک رفاقت کا حق ادا کیا۔ حضرت علی رضی اللہ عنہ نے اس بستر پر قدم رکھا جو صبح کو مقتل بننے والا تھا۔ حضرت زید رضی اللہ عنہ غلامِ خاص وہ تھے جنھوں نے پتہ ملنے پر اپنے باپ کے اصرار پر بھی اپنے روحانی باپ سے جدائی گوارا نہ کی۔

گارڈ فری ہیگنس ''اپالوجی فار محمد'' (ﷺ) میں کہتا ہے:

> ''عیسائی اس کو یاد رکھیں کہ محمد (ﷺ) کے پیغام نے وہ نشہ آپ کے پیروؤں میں پیدا کر دیا تھا جس کو عیسیٰ علیہ السلام کے ابتدائی پیروؤں میں تلاش کرنا بے سود ہے۔ جب عیسیٰ علیہ السلام کو سولی پر لے گئے تو ان کے پیرو بھاگ گئے۔ ان کا نشۂ دینی جاتا رہا اور وہ اپنے نبی کو موت کے پنجے میں گرفتار چھوڑ کر چل دیے۔ برعکس اس کے محمد (ﷺ) کے پیرو اپنے مظلوم پیغمبر کے گرد آئے اور آپ کے بچاؤ میں اپنی جانیں خطرے میں ڈال کر کل دشمنوں پر آپ ﷺ کو غالب کر دیا۔''[1]

اُحد کے مشہور معرکے میں جب قریش کے تیغ زنوں نے آپ ﷺ پر یورش کی اور مسلمانوں کی صفیں درہم برہم ہوئیں تو آپ ﷺ نے آواز دی کہ ''کون مجھ پر اپنی

[1] اپالوجی فار محمد (اردو ترجمہ)، ص: 67,66.

جان دیتا ہے؟'' اس آواز کو سن کر دفعتاً سات انصاری نکل آئے اور ایک ایک نے جانبازی سے لڑ کر جانیں فدا کر دیں۔ ایک انصاری خاتون کے باپ، بھائی اور شوہر، تین پیاری جانیں اس معرکے میں قربان ہوئیں۔ باری باری تین سخت حادثوں کی صدائیں اس کے کانوں میں پڑتی ہیں اور وہ ہر بار صرف یہی پوچھتی ہے کہ وہ جانِ عالم رسول اللہ ﷺ کیسے ہیں؟ لوگوں نے کہا: ''خیریت سے ہیں'' اس نے پاس آکر چہرۂ مبارک دیکھا اور بے اختیار پکار اٹھی:

«كُلُّ مُصِيبَةٍ بَعْدَكَ جَلَلٌ»

''تیرے ہوتے ہوئے سب مصیبتیں ہیچ ہیں۔''[1]

میں بھی، باپ بھی، شوہر بھی، برادر بھی فدا
اے شہِ دین ترے ہوتے ہوئے کیا چیز ہیں ہم

دوستو! یہ محبت، یہ عشق، یہ جان نثاری ان میں تھی جو آپ کو ہر طرح اور ہر حیثیت سے جانتے تھے۔ کیا ایسے شخص کے ساتھ جس کی زندگی اس کے ساتھیوں اور رفیقوں کی نگاہ میں کامل نہ ہو، اس لائق ہوسکتی ہے کہ اس پر وہ جانیں قربان کریں۔ اس سے زیادہ یہ ہے کہ اسلام نے اپنے پیغمبر ﷺ کی زندگی کو ان کے لیے نمونہ بتایا اور اس کی پیروی کو اللہ کی محبت کا ذریعہ بتایا۔ فرمانِ الٰہی ہے:

﴿ قُلْ إِنْ كُنْتُمْ تُحِبُّونَ اللَّهَ فَاتَّبِعُونِي يُحْبِبْكُمُ اللَّهُ ﴾

''کہہ دیجیے: (اے لوگو!) اگر تم اللہ سے محبت کرتے ہو تو میری پیروی کرو، اللہ تم سے محبت کرے گا۔''[2]

[1] سیرة ابن ھشام: 105/3. [2] آلِ عمرٰن 31:3.

آپ کی اتباع کو اللہ کی محبت کا معیار بتایا۔ ایک لمحے کے لیے نشۂ دینی سے سرمست ہوکر اپنی جان دینا آسان ہے مگر پوری عمر ہر چیز میں، ہر حالت میں، ہر کیفیت میں آپ کی اتباع کے پل صراط کو اس طرح طے کرنا کہ کسی بات میں سنتِ محمدی ﷺ سے قدم ادھر ادھر نہ ہو، سب سے مشکل امتحان ہے۔ اس اتباع کے امتحان میں تمام صحابہ رضی اللہ عنہم پورے اترے اور اسی جذبے نے صحابہ رضی اللہ عنہم، تابعین، تبع تابعین، محدثین، مؤرخین اور اربابِ سیر رحمہم اللہ کا یہ اہم فرض قرار دیا ہے کہ وہ آپ کی ایک ایک بات ایک ایک چیز اور ایک ایک جنبش کو معلوم کریں اور پچھلوں کو بتائیں تاکہ اپنے اپنے امکان بھر ہر مسلمان اس پر چلنے کی کوشش کرے۔ اس نکتے سے ظاہر ہوگا کہ آپ ﷺ کی زندگی اس کے جاننے والوں کی نگاہ میں پوری کامل تھی، تب ہی تو اس کی اتباع کو انھوں نے کمال کا معیار یقین کیا۔

اسلام کی نگاہ میں نبی ﷺ کی حیات ایک مسلمان کے لیے کامل نمونہ ہے۔ اس لیے اس نمونے کے تمام پہلو سب کے سامنے ہونے چاہییں اور وہ سب کے سامنے ہیں۔ اسی سے ثابت ہوگا کہ آپ ﷺ کی زندگی کے سلسلے کی کوئی کڑی گم نہیں ہے۔ کوئی واقعہ زیرِ پردہ نہیں ہے۔ جو کچھ ہے وہ تاریخ کے صفحات میں آئینہ ہے اور یہی ایک ذریعہ کسی زندگی کے کامل، معصوم اور بے گناہ یقین کرنے کا ہے۔ نیز ایسی ہی زندگی جس کے سب پہلو اس طرح روشن ہوں، انسان کے لیے کامل نمونے کا کام دے سکتی ہے۔

دنیا میں بابل واسیریا، ہندوستان و چین، مصر و شام اور یونان و روم میں بڑے بڑے تمدن پیدا ہوئے۔ اخلاق کے بڑے بڑے نظریے قائم کیے گئے۔ تہذیب و شائستگی

کے بڑے بڑے اصول بنائے گئے۔ اٹھنے بیٹھنے، کھانے پینے، ملنے جلنے، پہننے اوڑھنے، رہنے سہنے، سونے جاگنے، شادی بیاہ، مرنے جینے، غم و مسرت، دعوت و ملاقات، مصافحہ وسلام، غسل وطہارت، عیادت وتعزیت، تبریک وتہنیت، کفن و دفن کے بہت سے رسوم وآداب، شرائط اور ہدایات مرتب ہوئے اور ان سے ان قوموں کی تہذیب وتمدن اور معاشرت کے اصول بنائے گئے۔ یہ اصول صدہا سال میں بنے، پھر بھی بگڑ گئے۔ صدیوں میں ان کی تعمیر ہوئی تاہم وہ فنا ہوگئے۔ لیکن اسلام کا یہ تمدن چند برسوں میں بنا اور تعمیر ہوا اور چودہ سو برس سے کل روئے زمین کی سیکڑوں مختلف اقوام میں یکسانی کے ساتھ قائم ہے کیونکہ اس کا ماخذ ایک ہے اور وہ محمد رسول اللہ ﷺ کی زندگی ہے۔ اس زندگی کے آئینے میں صحابہ رضی اللہ عنہم نے اپنی زندگیاں سجائیں اور اس کا عکس تابعین رحمہم اللہ نے اتارا اور اس طرح وہ تمام دنیائے اسلام کا عمل بن گئی۔ وہ مقدس زندگی مرکزی نقطہ تھی۔ صحابہ رضی اللہ عنہم نے اس کو خط اور بعد کی نسلوں نے اس کو دائرہ بنادیا۔ وہ تمدن گو آج کامل نہیں مگر اس کے نقشِ قدم اب بھی ہیں اور اسی پر تمام مسلمان چل رہے ہیں۔ ایک محمد رسول اللہ ﷺ کی زندگی تھی جو تمام صحابۂ کرام رضی اللہ عنہم کی زندگی بن گئی اور وہی کبھی دنیائے اسلام کی زندگی بن گئی تھی اور وہ کامل تصویر آج بھی ہم میں موجود ہے۔

افریقہ یا ہندوستان کا کوئی قبیلہ جب آج عیسائی ہوتا ہے تو اس کو مذہب اگرچہ انجیل سے لیکن تمدن وتہذیب اور عملی زندگی کا سبق یورپ کے خود ساختہ تمدن سے سکھایا جاتا ہے، لیکن وحشی سے وحشی قبیلہ بھی جو مسلمان ہوتا ہے، اس کو جہاں سے مذہب ملتا ہے وہیں سے تمدن وتہذیب اور شائستگی کا سبق بھی ملتا ہے۔ مسلمان ہونے کے ساتھ پیغمبر اسلام ﷺ کی پوری زندگی انسانی ضروریات اور حالات کے ساتھ اس

کے سامنے آجاتی ہے اور یہ بولتی چالتی، جیتی جاگتی تصویر ہر مسلمان کی زندگی کی حالت اور کیفیت کا آئینہ بن جاتی ہے۔

ایک یہودی نے ایک صحابی سے طنزاً کہا تھا کہ تمھارا پیغمبر تم کو ہر چیز کی تعلیم دیتا ہے اور معمولی معمولی باتیں بھی سکھاتا ہے۔ انھوں نے فخر سے کہا کہ ہاں ہمارا پیغمبر ہمیں ہر چیز کی تعلیم دیتا ہے یہاں تک کہ اس نے استنجا کی بھی تعلیم دی ہے۔[1]

آج بھی ہم اس کامل تعلیم کی سیرت کو فخر کے ساتھ دنیا کے سامنے پیش کرتے ہیں۔ گویا سیرت محمدی ﷺ دنیا کا آئینہ خانہ ہے جس میں دیکھ کر ہر شخص اپنے جسم وروح، ظاہر و باطن، قول و عمل، زبان و دل، آداب و رسوم، طور وطریق کی اصلاح اور درستی کر سکتا ہے۔ اسی لیے کوئی مسلمان قوم اپنی شائستگی اور ادب و اخلاق کے لیے اپنے مذہب سے باہر اور اپنے رسول کی سیرت سے الگ کوئی چیز نہیں مانگتی اور نہ اس کو ضرورت ہے۔

سیرت محمدی ﷺ دنیائے اسلامی کا عالمگیر آئینہ ہے۔ اسی کے مقابلے سے اچھائی و برائی اور نیک و بدی کا راز اس پر کھلتا ہے اور چونکہ کوئی کامل انسانی زندگی اس قدر جامع انداز میں دنیا کے سامنے موجود نہیں، اس لیے تمام انسانوں کے لیے یہی ایک کامل نمونہ ہے اور ایسی ہی کامل زندگی انسانوں کے لیے قابلِ عمل نمونہ ہو سکتی ہے۔

[1] صحیح مسلم، حدیث: 262.

سیرت نبوی ﷺ کامل ترین مثال

اللہ کی محبت کا اہل اوراس کے پیار کا مستحق بننے کے لیے ہر مذہب نے ایک ہی تدبیر بتائی ہے اور وہ یہ ہے کہ اس مذہب کے شارع اور طریقے کے بانی نے جو عمدہ نصیحتیں کی ہیں ان پر عمل کیا جائے۔لیکن اسلام نے اس سے بہتر تدبیر اختیار کی ہے۔ اس نے اپنے پیغمبر ﷺ کا عملی نمونہ سب کے سامنے رکھ دیا ہے اوراس عملی نمونے کی پیروی اور اتباع کو اللہ کی محبت کے اہل اور اس کے پیار کے مستحق بننے کا ذریعہ بنایا ہے، چنانچہ اسلام میں دو چیزیں ہیں، کتاب اور سنت، کتاب سے مقصود اللہ کے احکام ہیں جو قرآن مجید کے ذریعے سے ہم تک پہنچے ہیں اور سنت جس کے لغوی معنی راستے کے ہیں، وہ راستہ جس پر پیغمبر اسلام ﷺ اللہ کے احکام پر عمل کرتے ہوئے گزرے، یعنی آپ کا عملی نمونہ جس کی تصاویر احادیث میں بصورت الفاظ ہیں۔ الغرض ایک مسلمان کی کامیابی کے لیے جو چیز ہے وہ سنتِ نبوی ﷺ ہے۔

وہ تمام اشخاص جو کسی مذہب کے حلقۂ اطاعت میں داخل ہوں، ناممکن ہے کہ وہ کسی ایک ہی صنفِ انسانی سے متعلق ہوں۔اس دنیا کی بنیاد ہی اختلافِ عمل پر ہے۔ باہمی تعاون اور مختلف پیشوں اور کاموں ہی کے ذریعے سے یہ دنیا چل رہی ہے۔اس

میں بادشاہ یا رئیسِ جمہور اور حکّام بھی ضروری ہیں اور محکوم و مطیع اور فرمانبردار ورعایا بھی، امن وامان کے قیام کے لیے قاضیوں اور ججوں کا ہونا بھی ضروری ہے اور فوجوں کے سپہ سالاروں اور افسروں کا بھی، غریب بھی ہیں دولت مند بھی، رات کے عابد و زاہد بھی ہیں اور دن کے سپاہی اور مجاہد بھی، اہل و عیال بھی ہیں اور دوست احباب بھی، تاجر اور سوداگر بھی ہیں اور امام و پیشوا بھی۔ غرض دنیا کا نظم ونسق ان مختلف اصناف کے وجود اور قیام ہی پر موقوف ہے اور ان تمام اصناف کو اپنی اپنی زندگی کے لیے عملی نمونے کی ضرورت ہے۔ اسلام ان تمام انسانوں کو سنتِ نبوی ﷺ کی اتباع کی دعوت دیتا ہے۔ اس کے صاف معنی یہ ہیں کہ وہ مختلف طبقاتِ انسانی کے لیے اپنے پیغمبر ﷺ کی عملی سیرت میں نمونے اور مثالیں رکھتا ہے جو ان میں سے ہر ایک کے لیے الگ الگ ہدایت کا چراغ بن سکتا ہے۔ اسلام کے صرف اسی نظریے سے ثابت ہوجاتا ہے کہ پیغمبر اسلام ﷺ کی سیرت میں انسانوں کے ہر طبقے اور صنف کے لیے نصیحت پذیری اور عمل کے لیے درس اور سبق موجود ہیں۔ ایک حاکم کے لیے محکوم کی زندگی اور محکوم کے لیے حاکم کی زندگی، ایک دولت مند کے لیے غریب کی زندگی اور ایک غریب کے لیے دولت مند کی زندگی کامل مثال اور نمونہ نہیں بن سکتی۔ اسی لیے ضرورت ہے کہ عالمگیر اور دائمی پیغمبر کی زندگی ان تمام مختلف مناظر کے رنگ برنگ پھولوں کا گلدستہ ہو۔

انسانی اصناف کے بعد دوسری جامعیت خود ہر انسان کے مختلف لمحوں کے مختلف افعال کی ہے۔ ہم چلتے پھرتے بھی ہیں، اٹھتے بیٹھتے بھی ہیں، کھاتے پیتے بھی ہیں، سوتے جاگتے بھی ہیں، پہنتے بھی ہیں اور اتارتے بھی ہیں، ہنستے بھی ہیں اور روتے بھی

ہیں، نہاتے بھی ہیں اور دھوتے بھی ہیں، لیتے بھی ہیں اور دیتے بھی ہیں، سیکھتے بھی ہیں اور سکھاتے بھی ہیں، مرتے بھی ہیں اور مارتے بھی ہیں، کھاتے بھی ہیں اور کھلاتے بھی ہیں، احسان کرتے بھی ہیں اور احسان لیتے بھی ہیں، اپنی جان دیتے بھی ہیں اور جان بچاتے بھی ہیں، عبادت و دعا بھی کرتے ہیں اور کاروبار بھی، مہمان بھی بنتے ہیں اور میزبان بھی۔ ہم کو ان تمام امور کے متعلق جو ہمارے مختلف افعالِ جسمانی سے متعلق ہیں، عملی نمونوں کی ضرورت ہے جو ہم کو ہر نئی حالت کے پیش آنے میں ایک نئی ہدایت کا سبق اور نئی رہنمائی کا درس دیں۔

ان افعال کے بعد جن کا تعلق اعضاء سے ہے، وہ افعال ہیں جن کا تعلق دل و دماغ سے ہے اور جن کی تعبیر ہم اعمال قلب یا جذبات اور احساسات سے کرتے ہیں۔ ہر آن ہم ایک نئے قلبی عمل یا جذبے یا احساس سے متاثر ہوتے ہیں۔ ہم کبھی راضی ہوتے ہیں، کبھی ناراض، کبھی خوش ہیں، کبھی غمزدہ، کبھی مصائب سے دوچار ہیں اور کبھی نعمتوں سے مالا مال، کبھی ناکام ہوتے ہیں اور کبھی کامیاب۔ ان سب حالتوں میں ہم مختلف جذبات کے ماتحت ہوتے ہیں۔ اخلاقِ فاضلہ کا تمام تر انحصار انھی جذبات اور احساسات کے اعتدال اور باقاعدگی پر ہے۔ ان سب کے لیے ہم کو ایک عملی سیرت کی حاجت ہے جس کے ہاتھ میں ہماری ان اندرونی سرکش اور بے قابو قوتوں کی باگ ڈور ہو جو انھی راستوں پر ہمارے نفس کی غیر معتدل قوتوں کو لے چلے جن پر سے مدینہ کا بے نفس انسان کبھی گزر چکا ہے۔

عزم، استقلال، شجاعت، صبر، شکر، توکل، رضا، مصیبتوں کی برداشت، قربانی، قناعت، ایثار، جود، تواضع، خاکساری، مسکینی، غرض نشیب و فراز اور بلند و پست تمام

اخلاقی پہلوؤں کے لیے جو مختلف انسانوں کو مختلف حالتوں میں یا ہر انسان کو مختلف صورتوں میں پیش آتے ہیں، ہم کو عملی ہدایت اور مثال کی بھی ضرورت ہے مگر وہ کہاں مل سکتی ہے؟ صرف محمد رسول اللہ ﷺ کے پاس۔

حضرت موسیٰ علیہ السلام کے پاس ہم کو سرگرم شجاعانہ قوتوں کا خزانہ مل سکتا ہے مگر نرم اخلاق کا نہیں۔ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے ہاں نرم اخلاق کی بہتات ہے مگر سرگرم اور خون میں حرکت پیدا کرنے والی قوتوں کا وجود نہیں۔ انسان کو اس دنیا میں ان دونوں قوتوں کی جامع اور معتدل مثالیں صرف پیغمبرِ اسلام ﷺ کی سوانح میں مل سکتی ہیں۔

غرض ایک ایسی شخصی زندگی جو ہر حالتِ انسانی کے مختلف مظاہر اور ہر قسم کے صحیح جذبات اور کامل اخلاق کا مجموعہ ہو، صرف محمد رسول اللہ ﷺ کی سیرت ہے۔

- اگر دولت مند ہو تو مکے کے تاجر اور بحرین کے خزینہ دار کی تقلید کرو۔
- اگر غریب ہو تو شعبِ ابی طالب کے قیدی اور مدینہ کے مہمان کی کیفیت سنو۔
- اگر بادشاہ ہو تو سلطانِ عرب کا حال پڑھو۔
- اگر رعایا ہو تو قریش کے محکوم کو ایک نظر دیکھو۔
- اگر فاتح ہو تو بدر و حنین کے سپہ سالار پر نگاہ دوڑاؤ۔
- اگر تم نے شکست کھائی ہے تو معرکۂ اُحد سے عبرت حاصل کرو۔
- اگر تم استاد اور معلم ہو تو صفہ کی درس گاہ کے معلمِ اقدس کو دیکھو۔
- اگر شاگرد ہو تو روح الامین کے سامنے بیٹھنے والے پر نظر جماؤ۔
- اگر واعظ اور ناصح ہو تو مسجد مدینہ کے منبر پر کھڑے ہونے والے کی باتیں سنو۔
- اگر تنہائی و بے کسی کے عالم میں حق کی منادی کا فرض انجام دینا چاہتے ہو تو

مکے کے بے یارومددگار نبی ﷺ کا اسوۂ حسنہ تمھارے سامنے ہے۔

☼ اگر تم حق کی نصرت کے بعد اپنے دشمنوں کو زیر اور مخالفوں کو کمزور بنا چکے ہو تو فاتح مکہ کا نظارہ کرو۔

☼ اگر تم اپنے کاروبار اور دنیاوی جدوجہد کا نظم و نسق درست کرنا چاہتے ہو تو بنونضیر، خیبر اور فدک کی زمینوں کے مالک کے کاروبار اور نظم و نسق کو دیکھو۔

☼ اگر یتیم ہو تو عبداللہ و آمنہ کے جگر گوشہ کو نہ بھولو۔

☼ اگر بچے ہو تو حلیمہ سعدیہ کے لاڈلے بچے کو دیکھو۔

☼ اگر تم جوان ہو تو مکے کے ایک چرواہے کی سیرت پڑھو۔

☼ اگر سفری کاروبار میں ہو تو بُصریٰ کے کاروانِ سالار کی مثالیں ڈھونڈو۔

☼ اگر عدالت کے قاضی اور پنچائتوں کے ثالث ہو تو کعبہ میں نور آفتاب سے پہلے داخل ہونے والے ثالث کو دیکھو جو حجر اسود کو کعبے کے ایک گوشے میں کھڑا کر رہا ہے۔

☼ مدینے کی کچی مسجد کے صحن میں بیٹھنے والے منصف کو دیکھو جس کی نظرِ انصاف میں شاہ و گدا اور امیر و غریب برابر تھے۔

☼ اگر تم بیویوں کے شوہر ہو تو خدیجہ اور عائشہ رضی اللہ عنہما کے مقدس شوہر کی حیات پاک کا مطالعہ کرو۔

☼ اگر اولاد والے ہو تو حضرت فاطمہ رضی اللہ عنہا کے باپ اور حسن و حسین رضی اللہ عنہما کے پیارے نانا جان کا حال پوچھو۔

غرض تم جو کوئی بھی ہو کسی حال میں بھی ہو تمھاری زندگی کے لیے نمونہ، تمھاری

سیرت کی درستی و اصلاح کے لیے سامان، تمھارے ظلمت خانے کے لیے ہدایت کا چراغ اور رہنمائی کا نور محمد رسول اللہ ﷺ کی جامعیت کبریٰ کے خزانے میں ہر وقت مل سکتا ہے۔ اس لیے طبقۂ انسانی کے ہر طالب اور نور ایمان کے ہر متلاشی کے لیے صرف محمد رسول اللہ ﷺ کی سیرت، ہدایت کا نمونہ اور نجات کا ذریعہ ہے۔

جس کی نگاہ کے سامنے محمد رسول اللہ ﷺ کی سیرت ہے، اس کے سامنے نوح، ابراہیم، ایوب، یونس، موسیٰ اور عیسیٰ علیہم السلام سب کی سیرتیں موجود ہیں گویا تمام دوسرے انبیائے کرام علیہم السلام کی سیرتیں صرف ایک ہی جنس کی اشیاء کی دکانیں ہیں اور محمد رسول اللہ ﷺ کی سیرت اخلاق و اعمال کی دنیا کا سب سے بڑا بازار (مارکیٹ) ہے جہاں ہر جنس کے خریدار اور ہر شے کے طلب گار کے لیے بہترین سامان موجود ہے۔

پٹنہ کے مشہور واعظِ اسلام ماسٹر حسن علی ''نورِ اسلام'' نام کا ایک رسالہ نکالتے تھے۔ اس میں انھوں نے اپنے ایک ہندو تعلیم یافتہ دوست کی رائے لکھی ہے کہ اس نے ایک دن ماسٹر صاحب سے کہا: ''میں آپ کے پیغمبر (ﷺ) کو دنیا کا سب سے بڑا کامل انسان تسلیم کرتا ہوں۔'' انھوں نے پوچھا: ہمارے پیغمبر کے مقابلے میں تم حضرت عیسیٰ علیہ السلام کو کیا سمجھتے ہو؟ اس نے جواب دیا کہ محمد ﷺ کے مقابلے میں عیسیٰ علیہ السلام ایسے معلوم ہوتے ہیں جیسے کسی دانائے روزگار کے سامنے ایک بھولا بھالا بچہ بیٹھا ہوا، میٹھی میٹھی باتیں کر رہا ہو۔ انھوں نے دریافت کیا کہ تم کیوں پیغمبر اسلام ﷺ کو دنیا کا کامل ترین انسان جانتے ہو؟ اس نے جواب دیا کہ مجھ کو ان کی زندگی میں بیک وقت اس قدر متضاد اور متنوع اوصاف نظر آتے ہیں جو کسی ایک انسان میں تاریخ نے کبھی یکجا کر کے نہیں دکھائے۔ بادشاہ ایسا کہ ایک پورا ملک اس کی مٹھی میں ہو اور بے بس

ایسا کہ خود اپنے کو بھی اپنے قبضے میں نہ جانتا ہو بلکہ اللہ کے قبضہ میں۔ دولت مند ایسا کہ خزانے اونٹوں پر لدے ہوئے اس کے دارالحکومت میں آرہے ہوں اور محتاج ایسا کہ مہینوں اس کے گھر چولہا نہ جلتا ہو اور کئی کئی وقت اس پر فاقے سے گزر جاتے ہوں۔ سپہ سالار ایسا ہو کہ مٹھی بھر نہتے آدمیوں کو لے کر ہزاروں غرقِ آہن فوجوں سے کامیاب لڑائی لڑا ہو اور صلح پسند ایسا کہ ہزاروں پرجوش جاں نثاروں کی ہم رکابی کے باوجود صلح کے کاغذ پر بے چون و چرا دستخط کر دیتا ہو۔ شجاع اور بہادر ایسا کہ ہزاروں کے مقابلے میں تن تنہا کھڑا ہو اور نرم دل ایسا کہ کبھی اس نے انسانی خون کا ایک قطرہ بھی اپنے ہاتھ سے نہ بہایا ہو۔ باتعلق ایسا ہو کہ عرب کے ذرہ ذرہ کی اس کو فکر، بیوی بچوں کی اس کو فکر، غریب و مفلس مسلمانوں کی اس کو فکر، اللہ کی بھولی ہوئی دنیا کے سدھار کی اس کو فکر، غرض ساری دنیا کی اس کو فکر ہو اور بے تعلق ایسا کہ اپنے اللہ کے سوا کسی اور کی یاد اس کو نہ ہو اور اس کے سوا ہر چیز اس کو فراموش ہو۔

اس نے کبھی اپنی ذات کے لیے اپنے برا کہنے والوں سے بدلہ نہیں لیا اور اپنے ذاتی دشمنوں کے حق میں دعائے خیر کی اور ان کا بھلا چاہا۔ لیکن اللہ کے دشمنوں کو اس نے کبھی معاف نہیں کیا اور حق کا راستہ روکنے والوں کو ہمیشہ جہنم کی دھمکی دیتا اور عذاب الٰہی سے ڈراتا رہا۔ عین اس وقت جب اس پر ایک تیغ زن سپاہی کا دھوکا ہوتا ہو، وہ ایک شب زندہ دار زاہد کی صورت میں جلوہ نما ہو جاتا ہے۔ عین اس وقت جب اس پر کشور کشا فاتح کا شبہ ہو، وہ پیغمبرانہ معصومیت کے ساتھ ہمارے سامنے آجاتا ہے۔ عین اس وقت جب ہم اس کو ''شاہِ عرب'' کہہ کر پکارنا چاہتے ہیں، وہ کھجور کی چھال کا تکیہ لگائے کھردری چٹائی پر بیٹھا درویش نظر آتا ہے۔ عین اس وقت جب

عرب کے اطراف سے آ آ کر اس کے صحنِ مسجد میں مال و اسباب کا انبار لگا ہوتا ہے، اس کے گھر میں فاقے کی تیاری ہو رہی ہوتی ہے، عین اس عہد میں جب لڑائیوں کے قیدی مسلمانوں کے گھروں میں غلام اور لونڈی بن کر بھیجے جا رہے ہیں، فاطمہ بنت رسول ﷺ جا کر اپنے ہاتھوں کے چھالے باپ کو دکھاتی ہیں جو چکی پیستے پیستے اور مشکیزہ بھرتے بھرتے ہاتھ پر پڑ گئے تھے۔ عین اس وقت جب آدھا عرب اس کے زیر نگیں ہوتا ہے، حضرت عمر رضی اللہ عنہ حاضرِ دربار ہوتے ہیں۔ ادھر ادھر نظر اٹھا کر کاشانۂ نبوت کے سامان کا جائزہ لیتے ہیں، آپ ایک کھردری چارپائی یا چٹائی پر آرام فرما رہے ہیں اور جسم اطہر پر بانوں کے نشان پڑ گئے ہیں۔ ایک طرف مٹھی بھر جَو رکھے ہیں۔ ایک کھونٹی میں خشک مشکیزہ لٹک رہا ہے۔ سرورِ کائنات ﷺ کے گھر کی یہ کل کائنات دیکھ کر حضرت عمر رضی اللہ عنہ رو پڑتے ہیں۔ سبب دریافت کیا جاتا ہے۔ عرض کرتے ہیں یا رسول اللہ ﷺ! اس سے بڑھ کر رونے کا اور کیا موقع ہوگا؟ قیصر و کسریٰ باغ و بہار کے مزے لوٹ رہے ہیں اور آپ ﷺ پیغمبر ہو کر اس حالت میں ہیں۔ ارشاد ہوتا ہے کہ ''عمر! کیا تم اس پر راضی نہیں کہ قیصر و کسریٰ دنیا کے مزے لوٹیں اور ہم آخرت کی سعادت۔''[1]

ابوسفیان جو نبی ﷺ کے سب سے بڑے حریف تھے۔ فتح مکہ کے دن وہ حضرت عباس رضی اللہ عنہ کے ساتھ کھڑے ہو کر اسلامی لشکر کا تماشا دیکھ رہے ہیں۔ رنگ رنگ کی بیرقوں اور جھنڈیوں کے سائے میں اسلام کا دریا امڈتا آ رہا تھا۔ قبائل عرب کی موجیں جوش مارتی ہوئی بڑھتی چلی آ رہی ہیں۔ ابوسفیان کی آنکھیں اب بھی دھوکا کھاتی ہیں۔ وہ حضرت عباس رضی اللہ عنہ سے کہتے ہیں، عباس! تمھارا بھتیجا بادشاہ بن گیا۔ حضرت عباس رضی اللہ عنہ

[1] صحيح البخاري، حديث:2468.

کی آنکھیں کچھ اور دیکھ رہی تھیں۔فرمایا: ابوسفیان! یہ بادشاہی نہیں نبوت ہے۔[1]

عدی بن حاتم قبیلۂ طے کے رئیس، مشہور حاتم طائی کے فرزند تھے اور مذہباً عیسائی تھے۔ وہ نبیِ کریم ﷺ کے دربار میں آتے ہیں۔ صحابہ رضی اللہ عنہم کی عقیدت مندیوں اور جہاد کا ساز وسامان دیکھ کر ان کو اس فیصلے میں دقت ہوتی ہے کہ محمد (ﷺ) بادشاہ ہیں یا پیغمبر۔ اچانک مدینے کی ایک غریب لونڈی آکر کھڑی ہوتی ہے اور کہتی ہے کہ آپ سے کچھ عرض کرنا ہے۔ آپ فرماتے ہیں دیکھو مدینے کی جس گلی میں کہو میں تمھاری باتیں سن سکتا ہوں۔ یہ کہہ کر اٹھ کھڑے ہوتے ہیں اور اس کی حاجت پوری کر دیتے ہیں۔[2]

اس ظاہری جاہ وجلال کے پردے میں یہ عجز وانکسار اور یہ تواضع دیکھ کر عدی کی آنکھوں کے سامنے سے پردہ ہٹ جاتا ہے اور وہ دل میں فیصلہ کر لیتے ہیں کہ یہ یقیناً پیغمبرانہ شان ہے۔ فوراً گلے سے صلیب اتار دیتے ہیں اور محمد ﷺ کا حلقۂ اطاعت اپنی گردن میں ڈال لیتے ہیں۔

میں نے جو کچھ کہا ہے وہ محض شاعرانہ انشا پردازی نہیں بلکہ تاریخی واقعات ہیں۔ ایسی کامل و جامع ہستی جو اپنی زندگی میں ہر نوع اور ہر قسم، ہر گروہ اور ہر صنفِ انسانی کے لیے ہدایت کی مثالیں رکھتی ہو، وہ ہی اس لائق ہے جو اس اصناف و انواع سے بھری ہوئی دنیا کی عالمگیر اور دائمی رہنمائی کا کام انجام دے، جو غیظ وغضب، رحم وکرم، جودوسخا، فقروفاقہ، شجاعت و بہادری، رحم دلی، خانہ داری اور خدادانی، دنیا اور دین دونوں کے لیے ہم کو اپنی زندگی کے نمونوں سے بہرہ مند کر دے۔ جو دنیا کی بادشاہی کے ساتھ آسمان کی بادشاہی اور آسمان کی بادشاہی کے ساتھ دنیا کی بادشاہی کی بھی

[1] سيرة ابن هشام:4/47. [2] شمائل الترمذي، حديث:230.

بشارت دے اور دونوں بادشاہیوں کے قوانین وقواعد اور دستور العمل کو اپنی زندگی میں بَرت کر دکھا دے۔ عام طور پر یہ سمجھا جاتا ہے کہ دنیا میں صرف عفوودرگزر، معافی اورنرمی انسانیت کی تکمیل کے سب سے بڑے ذریعے ہیں بلکہ فقط یہی ذریعے ہیں۔ اس لیے جس ہستی میں صرف یہی ایک پہلو ہو وہی انسانیت کی سب سے بڑی معلم ومحسن ہے، لیکن ہمیں یہ بتاؤ کہ انسان کے اخلاق میں فقط یہی قوتیں ہیں یا اس کے مقابل کی قوتیں بھی ہیں؟ ایک انسان میں دیکھو تو غصہ اورکرم، محبت اور عداوت، خواہش اور قناعت، انتقام اورعفو ہر قسم کے فطری جذبات موجود ہیں۔ اس لیے ایک کامل معلم وہی ہوسکتا ہے جو انسانیت کے ان تمام قویٰ اور جذبات میں اعتدال پیدا کرکے ان کے صحیح استعمال کو متعین کردے۔

جن مذہبوں کو یہ دعویٰ ہے کہ ان کے پیغمبروں کی سیرتیں صرف رحم وکرم اورعفو ودرگزر پر مبنی ہیں، وہ مجھے بتائیں کہ اجتماعی حیثیت سے وہ کتنے دن ان سیرتوں کے مطابق عمل کرسکے؟ قسطنطین پہلے عیسائی بادشاہ سے لے کر آج تک عیسائی مذہب میں کتنے صاحب تاج وتخت پیدا ہوئے اورکتنی بادشاہیاں قائم ہوئیں۔مگران میں سے کس نے اپنی سلطنت کا قانون صرف اپنے پیغمبر کی سیرت کی پیروی کو قرار دیا۔ پھر ایسی سیرت جو عملی دنیا میں ہر حیثیت سے اپنے پیروؤں کے لیے نمونہ نہ ہو وہ کیونکر جامع کہی جاسکتی ہے۔

حضرت نوح علیہ السلام کی زندگی کفر کے خلاف غیظ وغضب کا ولولہ پیش کرتی ہے۔

حضرت ابراہیم علیہ السلام کی حیات بت شکنیوں کا منظر دکھاتی ہے۔

حضرت موسیٰ علیہ السلام کی زندگی کفار سے جنگ و جہاد، شاہانہ نظم ونسق اور اجتماعی

دستور و قوانین کی مثال پیش کرتی ہے۔

حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی زندگی صرف خاکساری، تواضع، عفو و درگزر اور قناعت کی تعلیم دیتی ہے۔

حضرت سلیمان علیہ السلام کی زندگی شاہانہ اولوالعزمیوں کی جلوہ گاہ ہے۔

حضرت ایوب علیہ السلام کی حیات صبر و شکر کا نمونہ ہے۔

حضرت یونس علیہ السلام کی سیرت ندامت اور اعتراف کی مثال ہے۔

حضرت یوسف علیہ السلام کی زندگی قید و بند میں بھی دعوتِ حق اور جوشِ تبلیغ کا سبق ہے۔

حضرت داود علیہ السلام کی سیرت حمد و ستائش اور دعا و زاری کا صحیفہ ہے۔

حضرت یعقوب علیہ السلام کی زندگی امید، اللہ پر توکل اور اعتماد کی مثال ہے۔

لیکن محمد رسول اللہ ﷺ کی سیرت مقدسہ کو دیکھو کہ اس میں نوح، ابراہیم، موسیٰ، عیسیٰ، سلیمان، داود، ایوب، یونس، یوسف اور یعقوب علیہم السلام سب کی زندگیاں اور سیرتیں سمٹ کر سما گئی ہیں۔

محدث خطیب بغدادی رحمہ اللہ کی ایک ضعیف روایت میں ہے کہ نبی ﷺ کی پیدائش کے وقت ندا آئی کہ "محمد ﷺ کو ملکوں ملکوں پھراؤ اور سمندر کی تہوں میں لے جاؤ کہ تمام دنیا ان کے نام و نشان کو پہچان لے۔ جن و انس، چرند و پرند بلکہ ہر جاندار کے سامنے لے جاؤ۔ ان کو آدم علیہ السلام کا خلق، شیث علیہ السلام کی معرفت، نوح علیہ السلام کی شجاعت، ابراہیم علیہ السلام کی دوستی، اسماعیل علیہ السلام کی زبان، اسحاق علیہ السلام کی رضا، صالح علیہ السلام کی فصاحت، لوط علیہ السلام کی حکمت، موسیٰ علیہ السلام کی سختی، ایوب علیہ السلام کا صبر، یونس علیہ السلام کی اطاعت، یوشع علیہ السلام کا جہاد، داود علیہ السلام کی آواز، دانیال علیہ السلام کی محبت، الیاس علیہ السلام کا وقار، یحییٰ علیہ السلام کی

پاکدامنی اور عیسیٰ علیہ السلام کا زہد عطا کرو اور تمام پیغمبروں کے اخلاق میں ان کو غوطہ دو۔"

جن علماء نے اس روایت کو اپنی کتابوں میں جگہ دی ہے، ان کا منشاء درحقیقت یہی ہے کہ وہ پیغمبر اسلام ﷺ کی صفتِ جامعیت کو نمایاں کریں کہ جو کچھ اور انبیاء علیہم السلام کو متفرق طور پر عطا ہوا تھا، وہ سب کچھ مجموعی طور پر آپ ﷺ کو عنایت ہوا۔

نبی ﷺ کو زندگی کے مختلف پہلوؤں میں دیکھو تو جامعیت کی صفتِ کاملہ پورے طور پر نمایاں ہو جائے گی۔ مکہ کے پیغمبر کو جب مکہ سے یثرب جاتے دیکھو تو کیا وہ پیغمبر تم کو یاد نہ آئے گا جو مصر سے مدین جاتا نظر آتا ہے۔ کوہِ حراء کے غار نشین اور کوہِ سینا کے تماشائی میں ایک حیثیت سے کیسی یکسانی نظر آتی ہے، مگر جو فرق ہے وہ یہ ہے کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام کی آنکھیں کھلی تھیں اور آپ ﷺ کی بند۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام باہر دیکھ رہے تھے اور آپ ﷺ اندر۔ کوہِ زیتون پر وعظ کہنے والے پیغمبر (حضرت عیسیٰ علیہ السلام) اور کوہِ صفا پر چڑھ کر یَا مَعْشَرَ قُرَیْش! کہہ کر پکارنے والے میں کتنی مشابہت ہے۔ بدر و حنین اور احزاب و تبوک والے سپہ سالار اور موابیوں ،عمونیوں اور اموریوں سے نبرد آزما پیغمبر (موسیٰ علیہ السلام) میں کس قدر مماثلث ہے۔

آپ ﷺ نے مکہ کے سات سرداروں کے حق میں بددعا کی تو آپ کی زندگی حضرت موسیٰ علیہ السلام کی مثل تھی۔ جب انھوں نے فرعونیوں پر بددعا کی جو معجزات پر معجزات دیکھ لینے کے باوجود بھی ایمان نہ لائے۔ جب آپ ﷺ نے اُحد میں اپنے دشمنوں کے حق میں دعائے خیر کی تو اس وقت گویا آپ ﷺ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے قالب میں تھے جنھوں نے کبھی اپنے دشمنوں کا بھی بُرا نہ چاہا۔ جب محمد رسول اللہ ﷺ کو تم مسجد نبوی کی عدالت گاہ اور پنچایتوں میں یا غزوات اور لڑائیوں میں دیکھو تو

حضرت موسیٰ علیہ السلام کی سیرت کا نقشہ کھنچ جائے گا۔ لیکن جب آپ کو مکانوں کے حجروں میں، پہاڑوں کی غاروں میں، رات کی تنہائیوں اور تاریکیوں میں دیکھو تو حضرت عیسیٰ علیہ السلام کا جلوہ نظر آئے گا۔ شب وروز کے چوبیس گھنٹوں میں آپ ﷺ کی زبانِ مبارک کی دعاؤں اور مناجاتوں کو سنو تو زبور والے داود علیہ السلام کا تم کو شک ہوگا۔ فتح مکہ کے سائے میں آپ ﷺ کو دیکھو تو شان و شوکت اور فوجوں والے سلیمان علیہ السلام کا مغالطہ ہوگا۔ اگر شعبِ ابی طالب میں آپ کو تین برس اس طرح محصور دیکھو کہ کھانے کا سامان تک بھی وہاں نہ پہنچ سکے تو مصری قید خانے کے پیغمبر یوسف علیہ السلام کا جلوہ دکھائی دے گا۔

حضرت موسیٰ علیہ السلام قانون لے کر آئے۔ حضرت داود علیہ السلام دعا اور مناجات لے کر اور حضرت عیسیٰ علیہ السلام زہد واخلاق لے کر، مگر محمد رسول اللہ ﷺ قانون بھی لائے، دعا ومناجات بھی اور زہد و اخلاق بھی۔ ان سب کا مجموعہ الفاظ و معانی میں قرآن مجید اور عمل میں سیرتِ محمدی ﷺ ہے۔

دوستو! اب سیرتِ محمدی ﷺ کی جامعیت کا ایک اور پہلو تم کو دکھاؤں۔ دنیا میں دو قسم کی تعلیم گاہیں ہیں۔ ایک وہ جہاں صرف ایک فن سکھایا جاتا ہے اور ہر فن کے لیے الگ الگ اور مستقل تعلیم گاہیں ہیں، جیسے: کوئی میڈیکل کالج ہے، کوئی انجینئرنگ کالج ہے۔ ایک آرٹ سکول ہے۔ ایک تجارت کا مدرسہ ہے۔ ایک زراعت کی تعلیم گاہ ہے۔ ایک قانون کی درس گاہ ہے۔ ایک فوجی تعلیم کے لیے ادارہ ہے۔ ان میں سے ہر مدرسہ اور تعلیم گاہ صرف ایک ہی قسم کے طالب علموں کی تعلیم کا انتظام کرسکتی ہے۔ میڈیکل کالج سے صرف ڈاکٹر نکلیں گے۔ زراعت کے کالج سے صرف زراعت کے

ماہر پیدا ہوں گے۔ قانون کے مدرسے سے صرف قانون دان تیار ہوں گے۔ تجارت کی تعلیم گاہ سے صرف تجارت کے واقف کار پیدا ہوں گے۔ علم وفن کے مدرسے کی خاک سے صرف اہلِ علم اور اہلِ فن اٹھیں گے۔ لٹریچر کی درسگاہ سے صرف انشاپرداز اور ادیب نکلیں گے۔ ملٹری کالج سے صرف سپاہی تیار ہوں گے۔ لیکن کہیں کہیں بڑی بڑی یونیورسٹیاں ہوتی ہیں۔ یہ دوسری قسم کی تعلیم گاہیں ہیں جو اپنی وسعت کے مطابق ہر قسم کی تعلیم و تربیت کا انتظام کرتی ہیں۔ ان کے احاطے میں ڈاکٹری کا کالج بھی ہوتا ہے اور صنعت و حرفت کا مدرسہ بھی۔ زراعت اور انجینئرنگ کی تعلیم گاہ بھی ہوتی ہے اور فوجی تعلیم کا سکول بھی۔ طلبہ مختلف اطراف سے آتے ہیں اور اپنے اپنے ذوق، مناسبتِ طبع اور استعداد کے مطابق ایک ایک کالج یا مدرسے کا انتخاب کر لیتے ہیں۔ پھر وہاں فوجوں کے جنرل اور سپاہی، عدالتوں کے قاضی اور قانون دان، کاروبار کے تاجر اور انجینئر، شفاخانوں کے حکیم اور ڈاکٹر، پیشوں اور صنعتوں کے واقف کار اور ماہر سب ہی تیار ہوتے ہیں۔

غور کرو تو معلوم ہوگا کہ صرف ایک ہی تعلیم، ایک ہی پیشے اور ایک ہی علم کے جاننے والوں سے انسانی سوسائٹی کی تکمیل نہیں ہوسکتی بلکہ ان سب کے مجموعہ سے وہ کمال کو پہنچتی ہے اور پہنچ سکتی ہے۔ اگر صرف ایک ہی علم اور ایک ہی پیشے کے ماہرین سے تمام دنیا معمور ہوجائے تو اس تمدن و تہذیب کی مشین فوراً بند ہوجائے اور انسانی کاروبار ایک دم ختم ہوجائے۔ یہاں تک کہ اگر تمام دنیا صرف زہد پیشہ خلوت نشینوں سے بھر جائے تب بھی وہ اپنی تکمیل کے درجے کو نہیں پہنچ سکتی۔

اب آؤ اس معیار سے مختلف انبیائے کرام علیہم السلام کی سیرتوں پر غور کریں۔ بقول

حضرت مسیح علیہ السلام درخت اپنے پھل سے پہچانا جاتا ہے، درسگاہیں اپنے معنوی فرزندوں اور شاگردوں سے پہچانی جاتی ہیں۔ تعلیمِ انسانی کی ان درسگاہوں کا جن کے اساتذہ انبیاء علیہم السلام ہیں، جائزہ لیں تو پہلے تو کہیں دس بیس، کہیں ساٹھ ستر، کہیں سو دوسو، کہیں ہزار دو ہزار، کہیں پندرہ بیس ہزار طالب علم آپ کو نظر آئیں گے۔ لیکن جب مدرسۂ نبوت کی آخری تعلیم گاہ کو دیکھو گے تو آپ کو ایک لاکھ سے زیادہ طالب علم بیک وقت نظر آئیں گے۔ پھر ان دوسری نبوت گاہوں کے طلبہ کو اگر جاننا چاہو کہ وہ کہاں کے تھے؟ کون تھے؟ کیسے تیار ہوئے؟ اور ان کے اخلاق و عادات، روحانی حالات اور دیگر سوانح زندگی کیا تھے؟ اور ان کی تعلیم و تربیت کے عملی نتائج کیسے ثابت ہوئے تو آپ کو ان سوالات کا کوئی جواب نہیں مل سکتا۔ مگر محمد رسول اللہ ﷺ کی درسگاہ میں ہر چیز تم کو مل سکتی ہے۔ اس کے ہر ایک طالب علم کا نام ونشان، حالات وسوانح، نتائج، تعلیم اور تربیت ہر چیز تاریخ اسلام کے اوراق میں ثبت ہے۔

آگے بڑھو! نبوت اور دعوتِ مذہب کی ہر ایک درسگاہ کا آج یہ دعویٰ ہے کہ اس کے دروازے ہر قوم کے لیے کھلے ہیں، مگر اس درسگاہ کے بانی اور معلّمِ اول کی سیرت پڑھو کہ کیا اس کے عہد میں کسی ایک ہی ملک، ایک ہی نسل، ایک ہی خاندان کے طالب علم اس میں داخل ہوئے اور ان کو داخلے کی اجازت دی گئی یا ان کی دعوت میں یہ جامعیت اور عالمگیری تھی کہ نسل آدم کا ہر ایک فرزند اور ارضِ خاکی کا ہر ایک باشندہ اس میں عملاً داخل ہوسکا یا اس کو داخل ہونے کے لیے آواز دی گئی۔

تورات کے تمام انبیاء علیہم السلام ملک عراق یا ملکِ شام یا ملک مصر سے آگے نہیں بڑھے، یعنی اپنے وطن میں جہاں وہ رہتے تھے محدود رہے اور نسل وقوم کے سوا غیروں کو انھوں

نے آواز نہیں دی۔ زیادہ تر ان کی کوششوں کا مرکز صرف اسرائیل کا خاندان رہا۔ عرب کے قدیم انبیاء علیہم السلام بھی اپنی اپنی قوموں کے ذمے دار تھے، وہ باہر نہیں گئے۔ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے مکتب میں بھی غیر اسرائیلی طالب علم کا وجود نہ تھا۔ وہ صرف اسرائیل کی کھوئی ہوئی بھیڑوں کی تلاش میں تھے۔[1] اور وہ غیروں کو تعلیم دے کر بچوں کی روٹی کتوں کے آگے ڈالنا پسند نہیں کرتے تھے۔ ہندوستان کے داعی پاک آریہ ورت سے باہر جانے کا خیال بھی دل میں نہیں لا سکتے تھے۔

اگرچہ بودھ کے پیرو بادشاہوں نے اس کے پیغام کو باہر کی قوموں تک پہنچایا، مگر یہ عیسائیوں کی طرح بعد کے پیروؤں کا فعل تھا۔ خود داعیِ مذہب کی سیرت اس عالمگیری اور جامعیت کی مثال سے خالی ہے۔

اب ذرا عرب کے اس اُمی معلم کی درس گاہ کا مطالعہ کریں کہ یہ کون طالب علم ہیں؟ یہ ابوبکر و عمر، عثمان و علی، طلحہ و زبیر رضی اللہ عنہم مکہ کے قریشی طالب علم ہیں۔ یہ کون ہیں؟ ابوذر اور انیس رضی اللہ عنہما ہیں۔ یہ مکہ سے باہر تہامہ کے غفار قبیلہ کے ہیں۔ یہ کون ہیں؟ یہ ابو ہریرہ اور طفیل بن عمرو رضی اللہ عنہما ہیں۔ یمن سے آئے ہیں اور دوس قبیلہ کے ہیں۔ یہ کون ہیں؟ یہ ابوموسیٰ اشعری اور معاذ بن جبل رضی اللہ عنہما ہیں۔ یہ بھی یمن سے آئے ہیں اور دوسرے قبیلوں کے ہیں۔ یہ کون ہیں؟ یہ ضماد بن ثعلبہ رضی اللہ عنہ ہیں۔ یہ قبیلۂ ازد کے ہیں۔ یہ کون ہیں؟ یہ خباب بن ارت رضی اللہ عنہ ہیں۔ یہ قبیلۂ تمیم کے ہیں۔ یہ مُنْقِذ بن حبان اور منذر بن عائذ رضی اللہ عنہما ہیں، عبد القیس کے قبیلہ کے ہیں اور بحرین سے آئے ہیں۔ یہ عبید و جعفر رضی اللہ عنہما عمان کے رئیس ہیں۔ یہ فروہ رضی اللہ عنہ ہیں، یہ معان، یعنی حدودِ شام کے

[1] انجیل متّٰی: باب 15، آیت: 24.

رہنے والے ہیں۔ یہ کالے کالے کون ہیں؟ یہ بلال رضی اللہ عنہ ہیں، ملکِ حبش والے۔ یہ کون ہیں؟ یہ صہیب رضی اللہ عنہ رومی کہلاتے ہیں۔ یہ کون ہیں؟ یہ ایران کے سلمان فارسی رضی اللہ عنہ ہیں۔ یہ فیروز دیلمی رضی اللہ عنہ ہیں۔ یہ مرکبود رضی اللہ عنہ ہیں، نسلاً ایرانی ہیں۔

حدیبیہ کی صلح 6 ھ میں وہ عہد نامہ مرتب کراتی ہے جو اسلام کا عین منشا ہے، یعنی قریش اور مسلمان دونوں فریق جنگ ختم کریں اور مسلمان جہاں چاہیں اپنے مذہب کی دعوت دیں۔ اس دل خواہ کامیابی کے بعد پیغمبر اسلام ﷺ نے کیا کیا؟ اسی سال 6 ھ میں تمام قوموں کے سلاطین اور امراء کے نام دعوتِ اسلام کے خطوط بھیجے اور ان کو اللہ کا پیغام پہنچایا۔ دحیہ کلبی رضی اللہ عنہ ہرقل قیصر روم کی بارگاہ میں، عبد اللہ بن حذافہ سہمی رضی اللہ عنہ خسرو پرویز شہنشاہ ایران کے دربار میں، حاطب بن ابی بلتعہ رضی اللہ عنہ مقوقس عزیز مصر کے یہاں، عمرو بن امیہ رضی اللہ عنہ حبش کے بادشاہ نجاشی کے پاس، شجاع بن وہب اسدی رضی اللہ عنہ شام کے رئیس حارث غسانی اور سلیط بن عمرو رضی اللہ عنہ روسائے یمامہ کے درباروں میں پیغمبر اسلام کے خطوط لے کر جاتے ہیں کہ محمد ﷺ کی درس گاہ میں داخلے کی عام اجازت ہے۔

حضرات! اس واقعے سے درسگاہِ محمدی کی جامعیت کا یہ پہلو نمایاں ہوتا ہے کہ اس میں داخلے کے لیے رنگ و روپ، ملک و وطن، قوم و نسل اور زبان و لہجے کا سوال نہ تھا بلکہ وہ دنیا کے تمام خانوادوں، تمام قوموں، تمام ملکوں اور تمام زبانوں کے لیے عام تھی۔

ع: صلائے عام ہے یارانِ نکتہ داں کے لیے

اب آؤ! اس درسگاہ کی حیثیت اور درجے کا پتہ لگائیں۔ کیا یہ وہ اسکول اور کالج

ہے جہاں ایک ہی فن کی تعلیم ہوتی ہے یا اس کی حیثیت ایک جامع اور عظیم الشان یونیورسٹی کی ہے جہاں ذوق، مناسبتِ طبع اور استعداد کے مطابق ہر ملک کے لوگوں اور ہر قوم کے افراد کو الگ الگ تعلیم ملتی ہے، حضرت موسیٰ علیہ السلام کی تعلیم گاہ کو دیکھو۔ وہاں صرف فوج کے سپاہی اور یوشع علیہ السلام جیسے فوجی افسر، قاضی اور کچھ مذہبی عہدیدار پائے جاتے ہیں۔

حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے طالب علموں کی تلاش کرو، چند زہد پیشہ فقراء فلسطین کی گلیوں میں ملیں گے۔ مگر محمد رسول اللہ ﷺ کے ہاں کیا نظر آئے گا؟ ایک طرف اصحمہ رضی اللہ عنہ حبش کا نجاشی بادشاہ، فروہ رضی اللہ عنہ معان کا رئیس، ذوالکلاع رضی اللہ عنہ حمیر کا رئیس، عامر بن شہر رضی اللہ عنہ قبیلۂ ہمدان کا رئیس، فیروز دیلمی اور مرکبود رضی اللہ عنہما یمن کے رئیس، عبید و جعفر رضی اللہ عنہما عمان کے رئیس۔ دوسری طرف بلال، یاسر، صہیب، خباب، عمار، ابوفکیہہ رضی اللہ عنہم کے سے غلام اور سمیہ، لبینہ، زنیرہ، نہدیہ، ام عبیس رضی اللہ عنہن کی سی لونڈیاں ہیں۔ غور سے دیکھو! امیر وغریب، شاہ و گدا اور آقا و غلام سب ایک صف میں کھڑے ہیں۔

ایک طرف اہل دانش، اسرارِ فطرت کو جاننے والے دنیا کے جہانباں اور ملکوں کے فرمانروا اس درسگاہ سے تعلیم پا کر نکلتے ہیں۔ ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ ہیں، عمر فاروق رضی اللہ عنہ ہیں، عثمان غنی رضی اللہ عنہ ہیں، علی مرتضیٰ رضی اللہ عنہ ہیں، معاویہ بن ابی سفیان رضی اللہ عنہ ہیں جنھوں نے مشرق سے مغرب تک، افریقہ سے ہندوستان کی سرحد تک ایسی حکمرانی کی کہ ان کے مقابلے میں دنیا کے بڑے سے بڑے شہنشاہ اور حکمران کی سیاست و تدبیر اور نظم و نسق کے کارناموں کی کوئی اہمیت نہیں رہتی۔ ان کے عدل و انصاف کے فیصلے، ایرانی دستور اور رومی قانون کو بے اثر کر دیتے ہیں اور دنیا کی سیاسی و انتظامی تاریخ میں وہ درجہ

حاصل کر لیتے ہیں جن کی مثال نہیں پیش کی جاسکتی۔

دوسری طرف خالد بن ولید، سعد بن ابی وقاص، ابوعبیدہ بن جراح اور عمرو بن عاص رضی اللہ عنہم پیدا ہوتے ہیں جو مشرق و مغرب کی دو ظالم اور انسانیت کے لیے لعنت سلطنتوں کا چند سال میں تختہ الٹ دیتے ہیں اور دنیا کے وہ فاتح اعظم اور سپہ سالارِ اکبر ثابت ہوتے ہیں جن کے فاتحانہ کارناموں کی دھاک آج بھی دنیا میں بیٹھی ہوئی ہے۔ سعد رضی اللہ عنہ نے عراق و ایران کا تاج شہنشاہی اتار کر اسلام کے قدموں میں ڈال دیا۔ خالد اور ابوعبیدہ رضی اللہ عنہما نے رومیوں کو شام سے نکال کر ابراہیم علیہ السلام کی زمین کی امانت مسلمانوں کے سپرد کردی۔ عمرو بن عاص رضی اللہ عنہ نے فرعون کی سرزمین وادیِ نیل، رومن شہنشاہی کے ہاتھوں سے چھین لی۔ عبداللہ بن زبیر اور ابن ابی سرح رضی اللہ عنہما نے افریقہ کا میدان دشمنوں سے جیت لیا۔ یہ وہ مشہور فاتح اور سپہ سالار ہیں جن کی قابلیتوں کو زمانے نے تسلیم کیا ہے اور تاریخ نے ان کی جرأت و بہادری کی شہادت دی ہے۔

تیسری طرف باذان بن ساسان رضی اللہ عنہ یمن، خالد بن سعید رضی اللہ عنہ صنعاء، مہاجر بن ابی امیہ رضی اللہ عنہ کندہ، زیاد بن لبید رضی اللہ عنہ حضر موت، عمرو بن حزم رضی اللہ عنہ نجران، یزید بن ابوسفیان تیماء، علاء بن حضرمی رضی اللہ عنہ بحرین وغیرہ بیسیوں وہ صحابہ ہیں جنھوں نے صوبوں اور شہروں کی کامیاب حکومت کی اور خلقِ الٰہی کو آرام پہنچایا۔

چوتھی طرف علماء اور فقہاء کی صف ہے۔ عمر بن خطاب، علی بن ابی طالب، عبداللہ بن عباس، عبداللہ بن مسعود، عبداللہ بن عمرو بن عاص، حضرت عائشہ، ام سلمہ، ابی بن کعب، معاذ بن جبل، زید بن ثابت اور ابن زبیر رضی اللہ عنہم ہیں جنھوں نے اسلام کے فقہ و قانون کی بنیاد ڈالی اور دنیا کے عظیم قانون دانوں میں انھوں نے خاص درجہ پایا۔

پانچویں صف عام اربابِ روایت وتاریخ کی ہے، مثلاً: حضرت ابوہریرہ، حضرت ابوموسیٰ اشعری، حضرت انس بن مالک، حضرت ابوسعید خدری، حضرت عبادہ بن صامت، حضرت جابر بن عبداللہ اور سیکڑوں صحابہ ہیں جو احکام ووقائع کے ناقل اور راوی ہیں۔

ایک چھٹی جماعت ان ستر صحابہ (اہل صفہ) کی ہے جن کے پاس سر رکھنے کے لیے مسجد نبوی کے چبوترے کے سوا کوئی جگہ نہ تھی۔ بدن پر کپڑوں کے سوا دنیا میں ان کی کوئی ملکیت نہ تھی۔ وہ دن کو جنگل سے لکڑیاں کاٹ کر لاتے اور ان کو بیچ کر خود کھاتے، کچھ اللہ کی راہ میں دیتے اور رات عبادت اور اطاعت میں بسر کرتے۔

ساتواں رخ دیکھو! ابوذر رضی اللہ عنہ ہیں جن کے مانند آسمان کے نیچے زیادہ حق گو کوئی پیدا نہیں ہوا۔ ان کے نزدیک آج کا کھانا کل کے لیے اٹھا رکھنا بھی شان توکل کے خلاف تھا۔ ان کو دربارِ رسالت نے ''مسیح الاسلام'' کا خطاب عنایت کیا تھا۔ سلمان فارسی رضی اللہ عنہ ہیں جو زہد وتقویٰ کی تصویر ہیں۔ عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما ہیں جنھوں نے 30 برس کامل اطاعت وعبادت میں گزارے اور جب ان کے سامنے خلافت پیش ہوئی تو فرمایا: ''اگر اس میں مسلمانوں کا ایک قطرہ بھی خون گرے تو مجھے منظور نہیں۔'' مصعب بن عمیر رضی اللہ عنہ ہیں جو اسلام سے پہلے قاقُم وحریر کے کپڑے پہنتے تھے اور نازونعمت میں پلے تھے اور جب اسلام لائے تو ٹاٹ اوڑھتے تھے اور پیوند لگے کپڑے پہنتے تھے اور جب شہادت پائی تو کفن کے لیے پوار کپڑا تک نہ ملا۔ پاؤں پر گھاس ڈال کر دفن ہوئے۔ عثمان بن مظعون رضی اللہ عنہ ہیں جو اسلام کے پہلے صوفی* کہلاتے ہیں۔ محمد بن

* اس سے مراد زہد وورع میں بلند مرتبے پر فائز ہونا ہے جسے بعض سیرت نگاروں نے ''صوفیت'' سے تعبیر کیا ہے۔ موجودہ تصوف جو اسلام کے متوازی ایک نظام ہے، اس سے وہ بالکل مبرا تھے۔ «

مسلمہ رضی اللہ عنہ ہیں جو فتنے کے زمانے میں کہتے تھے کہ اگر کوئی مسلمان تلوار لے کر میرے حجرے میں میرے قتل کرنے کو داخل ہو جائے تو میں اس پر وار نہ کروں گا۔

ابودرداء رضی اللہ عنہ ہیں جن کی راتیں نمازوں میں اور دن روزوں میں گزرتے تھے۔

ایک اور طرف دیکھو! یہ بہادر کارپردازوں اور عرب کے مدبرین کی جماعت ہے۔ اس میں طلحہ رضی اللہ عنہ ہیں، زبیر رضی اللہ عنہ ہیں، مغیرہ رضی اللہ عنہ ہیں مقداد رضی اللہ عنہ ہیں، سعد بن معاذ رضی اللہ عنہ ہیں، سعد بن عبادہ رضی اللہ عنہ ہیں، اُسید بن حضیر رضی اللہ عنہ ہیں، اسعد بن زرارہ رضی اللہ عنہ ہیں۔ کاروباری دنیا میں دیکھو تو مکہ کے تاجر اور بیوپاری اور مدینہ کے کاشت کار اور کسان بھی ہیں اور عبدالرحمٰن بن عوف رضی اللہ عنہ اور سعد بن زبیر رضی اللہ عنہما جیسے دولت مند بھی ہیں۔

ایک جماعت حق کے شہیدوں اور بے گناہ مقتولوں کی ہے جنھوں نے اللہ کی راہ میں اپنی عزیز جانیں قربان کیں، مگر حق کا ساتھ چھوڑنے پر راضی نہ ہوئے۔ حضرت خدیجہ رضی اللہ عنہا کے پہلے شوہر سے فرزند ہالہ رضی اللہ عنہ تلواروں سے قیمہ کیے گئے۔ سمیہ رضی اللہ عنہا، حضرت عمار رضی اللہ عنہ کی والدہ ابوجہل کی برچھی سے ہلاک ہوئیں۔ حضرت یاسر رضی اللہ عنہ کفار کے ہاتھوں اذیت اٹھاتے اٹھاتے فوت ہوگئے۔ حضرت خبیب رضی اللہ عنہ نے سولی پر جان دی۔ حضرت زید رضی اللہ عنہ نے تلوار کے سامنے گردن جھکائی۔ حرام بن ملحان رضی اللہ عنہ اور ان 69 رفقاء نے بئرِ معونہ پر عُصَیّہ، رِعل اور ذکوان کے قبائل کے ہاتھوں بے کسی کے ساتھ جام شہادت پیا۔ واقعۂ رجیع میں حضرت عاصم رضی اللہ عنہ اور ان کے سات رفقاء کے بدن بنولحیان کے سو تیر اندازوں کے تیروں سے چھلنی ہوئے۔ 7ھ میں ابن ابی العوجاء رضی اللہ عنہ کے 49 ساتھی بنوسلیم قبیلے کے ہاتھوں شہید ہوئے۔ حضرت کعب بن

«اس لیے اس سے عرف عام کا صوفی مراد لینا کسی طرح بھی درست نہیں ہے۔

عمر غفاری رضی اللہ عنہ اپنے ساتھیوں سمیت ذاتِ اطلاح کے میدان میں شہید ہوئے۔

دنیا کے مشہور مذہب کو صرف ایک سولی پر ناز ہے لیکن دیکھو اسلام میں کتنی سولیاں، کتنے مذبح اور کتنے مقتل ہیں؟

تلوار کی دھار ہو کہ برچھی کی انّی یا سولی کی لکڑی، بہر حال یہ ایک آنی تکلیف ہے، اس سے زیادہ استقلال اور اس سے زیادہ صبر و آزمائش کی وہ زندگیاں ہیں جو سالہا سال حق کی مصیبتوں میں گرفتار رہیں، جنھوں نے آگ کے شعلوں اور گرم ریت کے فرش پر آرام کیا اور پتھر کی سِلوں کو اپنے سینوں پر رکھا۔ جن کے گلوں میں رسیاں ڈال کر گھسیٹا گیا اور جب پوچھا گیا تو وہی محمد ﷺ کا کلمہ ان کی زبان پر تھا۔

شعب ابی طالب کی قید میں تین برس تک جنھوں نے طلح (ایک درخت) کے پتے کھا کھا کر زندگی بسر کی۔ ان میں سے ایک سعد بن ابی وقاص رضی اللہ عنہ کہتے ہیں کہ ایک رات بھوک کی شدت سے ایک سوکھا چمڑا مل گیا تو اسی کو دھو کر آگ پر بھون کر اور پانی میں ملا کر کھایا۔ عتبہ بن غزوان رضی اللہ عنہ کہتے ہیں کہ ہم سات مسلمان تھے۔ ان غیر فطری غذاؤں کو کھا کھا کر ہمارے منہ زخمی ہو گئے۔ خباب رضی اللہ عنہ جب اسلام لائے تو کافروں نے ان کو دہکتے ہوئے کوئلوں پر لٹایا یہاں تک کہ یہ دہکتے ہوئے کوئلے ان ہی کی پیٹھ کے نیچے ٹھنڈے ہو گئے۔ بلال رضی اللہ عنہ دوپہر کو جلتی ریت پر لٹائے جاتے اور سینے پر پتھر کی سل رکھ دی جاتی، ان کے گلے میں رسی باندھی جاتی اور گلی گلی ان کو گھسیٹا جاتا۔ ابوفکیہہ رضی اللہ عنہ کو ان کے پاؤں میں رسی باندھ کر زمین پر گھسیٹا گیا، ان کا گلہ دبایا گیا۔ ان کے سینے پر اتنا بھاری پتھر رکھا گیا کہ زبان نکل پڑی۔ عمار رضی اللہ عنہ جلتی ریت کے فرش پر لٹائے جاتے اور مارے جاتے۔ حضرت زبیر رضی اللہ عنہ کو ان کا چچا چٹائی میں

لپیٹ کر ناک میں دھواں دیتا۔ سعید بن زید رضی اللہ عنہ رسیوں میں باندھ کر پیٹے جاتے۔ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کو ان کے چچا نے رسی سے باندھ کر مارا۔ یہ سب کچھ تھا مگر جو نشہ چڑھ چکا تھا وہ اترتا نہ تھا۔ یہ کیسا نشہ تھا؟ یہ ساقیِ کوثر کے حوضِ کوثر کا نشہ تھا۔

عزیزو! غور کا مقام ہے۔ یہ وہی وحشی عرب، وہی بت پرست عرب، وہی بداخلاق عرب ہیں۔ کیا انقلاب ہوگیا تھا؟ ایک اُمّی کی تعلیم جاہل عربوں کو عاقل، روشن دل اور روشن دماغ کیونکر بنا گئی؟ ایک نہتے پیغمبر کا ولولۂ تبلیغ کمزور عربوں کو سپہ سالار اور بہادر بنا کر نئے زور وقوت کا خزانہ کیسے عطا کر گیا؟ جو اللہ کے نام سے بھی آشنا نہ تھے، وہ ایسے شب زندہ دار عابد، متقی اور اطاعت گزار کیونکر ہوگئے؟ تم نے درس گاہِ محمدی یا مدینہ یونیورسٹی کی پوری سیر کرلی۔ ہر رنگ اور ہر مذاق کے طالب علم دیکھے، عالم بھی دیکھے، قانون دان بھی دیکھے، فوجی بھی دیکھے، قاضیِ عدالت بھی دیکھے، حکّام اور والی بھی دیکھے، غریب و مسکین بھی دیکھے، شاہ وامیر بھی دیکھے، غلام بھی دیکھے، آقا بھی دیکھے، لڑنے والے بھی دیکھے، مرنے والے بھی دیکھے، راہِ حق کے شہیدوں کو بھی دیکھا۔ تم نے کیا فیصلہ کیا؟

اس کے سوا کیا فیصلہ ہوسکتا ہے کہ محمد رسول اللہ ﷺ کی ذات انسانی کمالات اور صفاتِ حسنہ کا ایک کامل مجموعہ تھی اور یہ سب انھی کی جامعیت کی نیرنگیاں اور جلوہ آرائیاں تھیں جو کبھی صدیق و فاروق رضی اللہ عنہما ہوکر چمکتی تھیں، کبھی ذوالنورین اور مرتضیٰ رضی اللہ عنہما ہوکر نمایاں ہوتی تھیں۔ کبھی خالد و ابوعبیدہ رضی اللہ عنہما اور کبھی سعد و جعفر طیار رضی اللہ عنہما ہوکر سامنے آتی تھیں۔ کبھی ابن عمر، ابوذر، سلمان اور ابودرداء رضی اللہ عنہم ہوکر مسجد و محراب میں نظر آتی تھیں۔ کبھی ابن عباس، ابی بن کعب، زید بن ثابت اور عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہم کی صورت

میں علم وفن کی درسگاہ اور عقل وحکمت کا مدرسہ بن جاتی تھیں اور کبھی بلال وصہیب اور عمار و خبیب رضی اللہ عنہم کی امتحان گاہوں میں تسلی کی روح اور تسکین کا پیام بن جاتی تھیں۔ گویا محمد رسول اللہ ﷺ کا وجودِ مبارک آفتاب عالم تاب تھا جس سے اونچے پہاڑ، ریتلے میدان، بہتی نہریں، سرسبز کھیت اپنی اپنی صلاحیت اور استعداد کے مطابق تابش اور نور حاصل کرتے تھے یا ابرِ باراں تھا جو پہاڑ اور جنگل، میدان اور کھیت، ریگستان اور باغ ہر جگہ برستا تھا اور ہر ٹکڑا اپنی اپنی استعداد کے مطابق سیراب ہو رہا تھا اور قسم قسم کے درخت اور رنگا رنگ پھول اور پتے جم رہے تھے اور اُگ رہے تھے۔

ان نیرنگیوں کے ساتھ اور اس اختلافِ استعداد کے باوجود ایک چیز تھی جو مشترک طور سے سب میں نمایاں تھی۔ وہ ایک بجلی تھی جو سب میں کوندرہی تھی۔ ایک روح تھی جو سب میں تڑپ رہی تھی۔ وہ بادشاہ ہوں یا گدا، امیر ہوں یا غریب، حاکم ہوں یا محکوم، قاضی ہوں یا گواہ، افسر ہوں یا سپاہی، استاد ہوں یا شاگرد، عابدو زاہد ہوں یا کاروباری، غازی ہوں یا شہید، توحید کا نور، اخلاق کی رَو، قربانی کا ولولہ، خلق کی ہدایت اور رہنمائی کا جذبہ اور بالآخر ہر کام میں اللہ کی رضا طلبی کا جوش ہر ایک کے اندر کام کر رہا تھا۔ وہ کچھ بھی ہوں، جہاں بھی ہوں اور جو بھی کر رہے ہوں، یہ فیضان حق سب میں یکساں اور برابر تھا۔ راستوں، رنگتوں اور مزاجوں کا اختلاف تھا، مگر اللہ ایک تھا، قرآن ایک تھا، رسول ایک تھا اور قبیلہ ایک تھا۔ ہر رنگ، ہر راستے اور ہر کام سے مقصود دنیا کی درستی، خلق کی ہمدردی، اللہ تعالیٰ کے نام کی اونچائی اور حق کی ترقی تھی اور اس کے سوا کوئی چیز ان کے پیش نظر نہ تھی۔

دوستو! میں نے آج کی گفتگو میں محمد رسول اللہ ﷺ کی صفتِ جامعیت کی

نیرنگیاں مختلف پہلوؤں سے دکھائیں۔ اگر تم مطالعۂ فطرت کے بعد یقین رکھتے ہو کہ یہ دنیا انسانی مزاجوں اور صلاحیتوں کے اختلاف کا نام ہے تو یقین کرو کہ محمد رسول اللہ ﷺ کی جامع شخصیت کے سوا اس کا کوئی آخری، دائمی اور عالمگیر رہنما نہیں ہوسکتا۔ اسی لیے اعلان فرمایا:

﴿ قُلْ اِنْ كُنْتُمْ تُحِبُّوْنَ اللّٰهَ فَاتَّبِعُوْنِيْ يُحْبِبْكُمُ اللّٰهُ ﴾

''کہہ دیجیے! اگر تم اللہ سے محبت کرتے ہو تو میری پیروی کرو، اللہ تم سے محبت کرے گا۔''[1]

اگر تم بادشاہ ہو تو میری پیروی کرو، اگر تم رعایا ہو تو میری پیروی کرو، اگر تم سپہ سالار ہو یا سپاہی ہو تو میری پیروی کرو، اگر تم استاد اور معلم ہو تو میری پیروی کرو، اگر دولت مند ہو تو میری پیروی کرو، اگر غریب ہو تو میری پیروی کرو، اگر بے کس و مظلوم ہو تو میری پیروی کرو، اگر تم اللہ تعالیٰ کے عابد ہو تو میری پیروی کرو، اگر قوم کے خادم ہو تو میری پیروی کرو۔ غرض جس نیک راہ پر بھی ہو اور اس کے لیے بلند سے بلند اور عمدہ سے عمدہ نمونہ چاہتے ہو تو میری پیروی کرو۔

---

[1] آل عمرٰن 31:3.

سیرت نبوی ﷺ کا عملی پہلو

کیا آپ جانتے ہیں کہ محمد رسول اللہ ﷺ کی پیروی کس چیز میں اور کیونکر کرنی چاہیے؟ اس کے لیے آج آپ کو سیرت نبوی ﷺ کا عملی پہلو دکھانا ہے۔ یہ انبیائے کرام علیہم السلام اور بانیان مذاہب کی موجودہ سیرتوں کا وہ باب ہے جو تمام تر خالی اور سادہ ہے، لیکن محمد رسول اللہ ﷺ کی سیرت کا یہی باب سب سے بڑا اور ضخیم ہے اور تنہا یہی ایک معیار اس فیصلے کے لیے کافی ہے کہ نبیوں کا سردار اور رسولوں کا خاتم کون ہوسکتا ہے؟ مفید نصیحتوں، میٹھی میٹھی باتوں اور اچھی اچھی تعلیمات کی دنیا میں کمی نہیں۔ کمی جس چیز کی ہے وہ کام اور عمل ہے۔ موجودہ مذاہب کے بانیوں کی سیرتوں کے تمام صفحے پڑھ جاؤ، دلچسپ اور دلآویز حکایتیں ملیں گی، خطیبانہ بلند آہنگیاں ملیں گی، تقریر کا زور وشور اور فصاحت وبلاغت کا جوش نظر آئے گا۔ مگر جو چیز نہیں ملے گی، وہ عمل، کام اور اپنے احکام ونصائح پر عمل کر کے دکھانا ہے۔

انسان کی عملی سیرت کا نام خُلُق (اخلاق) ہے۔ قرآن کے سوا اور کسی مذہب کے صحیفے نے اپنے شارع کی نسبت اس بات کی کھلی شہادت نہیں دی ہے کہ وہ اپنے عمل کے لحاظ سے بھی بدرجہا بلند انسان تھا، لیکن قرآن مجید نے صاف کہا اور دوست ودشمن

کے مجمع میں علی الاعلان کہا:

”(اے محمد ﷺ) بے شک آپ کے لیے یقیناً ایسا اجر ہے جو منقطع ہونے والا نہیں اور بلاشبہ یقیناً آپ ایک بڑے خلق پر ہیں۔“ ①

پہلے ٹکڑے میں آپ ﷺ کے اجر کے نہ ختم ہونے کا دعویٰ ہے اور دوسرے ٹکڑے میں آپ ﷺ کے عمل اور اخلاق کو دلیل میں پیش کیا گیا ہے، یعنی آپ کے اعمال اور اخلاق خود اس کی دلیل ہیں کہ آپ کے اجر کا سلسلہ کبھی ختم نہ ہوگا۔ مکے کا اُمی معلم ﷺ پکار کر کہتا ہے:

”کیوں کہتے ہو تم جو کرتے نہیں۔“ ②

اور اس اعلان کا اس کو حق تھا کیونکہ وہ جو کچھ کہتا تھا، اس کو کر کے دکھا دیتا تھا۔

کوہِ زیتون کے واعظ (حضرت مسیح علیہ السلام) اور کوہِ صفا کے مبلغ (حضرت محمد رسول اللہ ﷺ) ان دونوں کی سیرتوں کو اس عملی حیثیت سے پڑھو اور مطالعہ کرو تو معلوم ہوگا کہ ایک کی سیرت اس سے یکسر خالی ہے تو دوسرے کی سرتاپا معمور، قوت پا کر عفو اور حلم پیش کرنا بلند اخلاقی ہے، لیکن کسی معذور، مجبور یا کمزور کی خاموشی کی تعبیر عفو و حلم سے نہیں کی جاسکتی۔ ایک شخص نے کسی کو مارا نہیں، کسی کو قتل نہیں کیا، کسی کے ساتھ برائی نہیں کی، کسی کا مال نہیں لوٹا، کوئی گھر نہیں بنایا، کچھ جمع نہیں کیا، لیکن یہ سب کی سب منفی اور سلبی خوبیاں ہیں۔ یہ بتاؤ کہ مارا تو نہیں ہے لیکن کسی غریب و کمزور کی مدد بھی کی؟ کسی کو قتل نہیں کیا لیکن کسی کو قتل ہونے سے بچایا بھی؟ کسی کے ساتھ برائی نہیں کی لیکن کسی کے ساتھ اچھائی بھی کی؟ کسی کا مال نہیں چھینا لیکن کسی غریب و مسکین کو کچھ

---

① القلم 68:3،4. ② الصف 61:2.

دیا بھی؟ اپنے لیے کوئی گھر نہیں بنایا لیکن کسی بے گھر اور بے خانماں کو پناہ بھی دی؟ اپنے لیے کچھ جمع نہیں کیا لیکن دوسروں کو کچھ دیا اور دلایا بھی؟ دنیا کو یہ ثبوتی اور ایجابی خوبیاں درکار ہیں اور انھی کا نام عمل ہے۔ قرآن مجید گواہی دیتا ہے:

”پس اللہ کی طرف سے بڑی رحمت ہی کی وجہ سے آپ ان کے لیے نرم ہوگئے اور اگر آپ بد خلق، سخت دل ہوتے تو یقیناً وہ آپ کے گرد سے منتشر ہو جاتے۔“[1]

یہ آپ ﷺ کی نرم دلی کا متواتر بیان ہے جو دعوے اور دلیل کے ساتھ خود صحیفۂ الٰہی میں موجود ہے کہ اگر آپ نرم دل اور رحیم نہ ہوتے تو یہ وحشی، نڈر، بے خوف اور درشت مزاج عرب کبھی آپ کے گرد جمع نہ ہوتے۔ دوسری جگہ ارشاد ہے:

”بلاشبہ یقیناً تمھارے پاس تمھی میں سے ایک رسول آیا ہے، اس پر بہت شاق ہے کہ تم مشقت میں پڑو۔ تم پر بہت حرص رکھنے والا ہے، مومنوں پر بہت شفقت کرنے والا، نہایت مہربان ہے۔“[2]

اس آیت پاک میں اللہ تعالیٰ نے رسول اللہ ﷺ کے ان رحم بھرے جذبات کا ذکر کیا ہے جو تمام بنی نوع انسان اور تمام بنی آدم کے ساتھ تھے، چنانچہ فرمایا: اے لوگو! تمھارا تکلیف و مصیبت اٹھانا، حق کے قبول سے انکار کرنا اور اپنی جہالت پر اس طرح ڈٹے رہنا رسول ﷺ پر شاق گزرتا ہے اور وہ تمھاری بھلائی اور خیر طلبی چاہنے والا ہے۔ بنی نوع انسان کے ساتھ یہی خیر خواہی تمھاری دعوت و تبلیغ اور نصیحت پر اس کو آمادہ کرتی ہے اور جو لوگ اس کی دعوت اور پکار کو سن لیتے ہیں، وہ ان کے ساتھ

① آلِ عمرٰن 3:159. ② التوبۃ 9:128.

شفقت اور مہربانی سے پیش آتا ہے۔

غرض اس آیت پاک میں اس بات کی شہادت ہے کہ محمد رسول اللہ ﷺ تمام بنی نوعِ انسان کے خیر خواہ اور خیر طلب تھے اور مسلمانوں پر خصوصیت کے ساتھ شفیق اور مہربان تھے۔ یہ آپ ﷺ کے عملی اخلاق کے متعلق آسمانی شہادتیں ہیں۔

قرآن مجید، اسلام کے احکام اور آپ ﷺ کی زبان مبارک سے جو تعلیمات انسانوں کو پہنچائی گئیں، ان کا مجموعہ ہے۔ بحیثیت ایک عملی پیغمبر کے آپ ﷺ کی سیرت مبارکہ درحقیقت قرآن مجید کی عملی تفسیر ہے۔ جو حکم آپ ﷺ پر اتارا گیا، آپ نے خود اس کو کر کے بتایا۔ ایمان، توحید، نماز، روزہ، زکاۃ، حج، صدقہ، خیرات، جہاد، ایثار، قربانی، عزم، صبر، شکر اور استقلال اور ان کے علاوہ حسنِ عمل و حسن وخلق کی باتیں جس قدر آپ ﷺ نے فرمائیں ان کے لیے سب سے پہلے آپ نے اپنا ہی نمونہ پیش کیا۔ جو کچھ قرآن میں تھا، وہ سب آپ ﷺ کی زندگی میں نظر آیا۔

چند صحابی حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کی خدمت میں حاضر ہوئے اور عرض کی کہ اے ام المومنین رضی اللہ عنہا! نبی ﷺ کے اخلاق اور معمولات بیان فرمایئے۔ ام المومنین رضی اللہ عنہا جواب میں کہتی ہیں کہ کیا تم نے قرآن نہیں پڑھا ہے؟

«فَإِنَّ خُلُقَ رَسُولِ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّم كَانَ الْقُرْآنَ»

"رسول اللہ کا اخلاق ہمہ تن قرآن تھا؟"[1]

قرآن مجید، الفاظ وعبارت ہے اور محمد رسول اللہ ﷺ کی سیرت اس کی عملی تفسیر ہے۔ انسان کے اخلاق، عادات اور اعمال کا بیوی سے بڑھ کر کوئی واقف کار نہیں ہوسکتا۔

[1] سنن أبي داود، حديث:1342.

آپ ﷺ نے جب نبوت کا اعلان کیا تو اس وقت حضرت خدیجہ رضی اللہ عنہا کے نکاح کو 15 برس ہو چکے تھے۔ یہ مدت اتنی بڑی ہے جس میں ایک انسان دوسرے کے عادات وخصائل اور طور طریقہ سے اچھی طرح واقف ہوسکتا ہے۔اس واقفیت کا اثر حضرت خدیجہ رضی اللہ عنہا پر یہ پڑتا ہے کہ ادھر آپ ﷺ کی زبان سے اپنی نبوت کی خبر نکلتی ہے، ادھر خدیجہ رضی اللہ عنہا کا دل اس کی تصدیق کو آمادہ ہو جاتا ہے۔آپ ﷺ جب نبوت کے بارِ گراں سے گھبراتے ہیں تو حضرت خدیجہ رضی اللہ عنہا تسکین دیتی ہیں کہ ''یا رسول اللہ ﷺ! اللہ آپ کو ہرگز تنہا نہیں چھوڑے گا کیونکہ آپ قرابت والوں کا حق پورا کرتے ہیں۔ مقروضوں کا قرض ادا کرتے ہیں۔ غریبوں کی مدد کرتے ہیں۔ مہمانوں کی خاطر تواضع کرتے ہیں۔حق کی طرف داری کرتے ہیں۔ مصیبتوں میں آپ لوگوں کے کام آتے ہیں۔''[1]

غور کیجیے! یہ آپ ﷺ کی وہ عملی مثالیں ہیں جو نبوت سے پہلے آپ میں موجود تھیں۔

آپ ﷺ کی تمام بیویوں میں حضرت خدیجہ رضی اللہ عنہا کے بعد آپ کو سب سے زیادہ محبوب حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا تھیں جو نو برس آپ کی صحبت میں رہیں۔ وہ گواہی دیتی ہیں کہ آپ ﷺ کی عادت کسی کو برا بھلا کہنے کی نہ تھی۔آپ برائی کے بدلہ میں برائی نہیں کرتے تھے بلکہ معاف کر دیتے تھے۔آپ گناہ کی بات سے کوسوں دور رہتے تھے۔ آپ ﷺ نے کبھی کسی سے اپنا بدلہ نہیں لیا۔ آپ ﷺ نے کبھی کسی غلام، لونڈی، عورت یا خادم یہاں تک کہ کسی جانور تک کو کبھی نہیں مارا۔آپ ﷺ نے کبھی کسی کی جائز اور مناسب درخواست اور فرمائش کو رد نہیں فرمایا۔[2]

① صحيح البخاري، حديث: 3. ② شمائل الترمذي، حديث: 346-348.

رشتے داروں میں حضرت علی رضی اللہ عنہ سے بڑھ کر کوئی آپ ﷺ کے دن رات کے حالات اور اخلاق سے واقف نہ تھا۔ وہ بچپن سے جوانی تک آپ ﷺ کی خدمت میں رہے تھے۔ وہ گواہی دیتے ہیں کہ آپ ﷺ ہنس مکھ، طبیعت کے نرم اور اخلاق کے نیک تھے۔ طبیعت میں مہربانی تھی۔ سخت مزاج نہ تھے۔ کوئی بُرا کلمہ کبھی منہ سے نہیں نکالتے تھے۔ لوگوں کے عیب اور کمزوریوں کو نہیں ڈھونڈتے تھے۔ کسی کی کوئی فرمائش اگر مزاج کے خلاف ہوتی تو خاموش رہ جاتے۔ نہ اس کو صاف جواب دے کر مایوس کرتے اور نہ اپنی منظوری ظاہر فرماتے تھے۔ واقف کار اس اندازِ خاص سے سمجھ جاتے کہ آپ کا منشا کیا ہے؟ یہ اس لیے تھا کہ آپ ﷺ کسی کا دل توڑنا نہیں چاہتے تھے۔ دل شکنی نہیں کرتے تھے بلکہ دلوں پر مرہم رکھتے تھے کہ آپ رؤف ورحیم تھے۔

حضرت علی رضی اللہ عنہ کہتے ہیں کہ ''آپ ﷺ نہایت فیاض، بڑے سخی، راست گو، نہایت نرم طبع تھے۔ لوگ آپ کی صحبت میں بیٹھتے تو خوش ہوجاتے۔ آپ ﷺ کو پہلی دفعہ جو دیکھتا وہ مرعوب ہوجاتا، لیکن جیسے وہ آپ ﷺ سے ملتا جاتا آپ سے محبت کرنے لگتا۔[1]

آپ کی سیرت پڑھ کر یہی خیال انگلینڈ کے سب سے مشہور مؤرخ گبن نے ظاہر کیا ہے۔

آپ ﷺ کے سوتیلے فرزند، یعنی حضرت خدیجہ رضی اللہ عنہا کے پہلے شوہر سے صاحبزادے حضرت ہند رضی اللہ عنہ جو آپ ﷺ کے پروردہ تھے، گواہی دیتے ہیں کہ ''آپ ﷺ کی طبیعت میں نرمی تھی۔ سخت مزاج نہ تھے۔ کسی کا دل نہیں دکھاتے تھے۔

[1] جامع الترمذي، حديث:3638.

کسی کی عزت کے خلاف کوئی بات نہ کہتے تھے۔ چھوٹی باتوں پر لوگوں کا شکریہ ادا کرتے تھے۔ کسی چیز کو برا نہیں کہتے تھے۔ کھانا جیسے سامنے آتا کھا لیتے، اس کو برا نہ کہتے۔ آپ ﷺ کو اپنے ذاتی معاملات میں کبھی غصہ نہیں آتا تھا نہ کسی سے بدلہ اور انتقام لیتے تھے اور نہ کسی کی دل شکنی گوارا کرتے تھے۔ لیکن اگر کوئی حق بات کی مخالفت کرتا تو حق کی طرف داری میں آپ ﷺ کو غصہ آجاتا تھا اور اس حق کی آپ ﷺ پوری حمایت فرماتے تھے۔"[1]

یہ آپ ﷺ کے حق میں ان لوگوں کی شہادتیں ہیں جو آپ ﷺ سے بہت نزدیک اور آپ ﷺ سے بہت زیادہ واقف تھے۔ اس سے یہ معلوم ہوگا کہ آپ ﷺ کی سیرت مبارکہ کی عملی حیثیت کیسی بلند تھی؟

نبی ﷺ کی سیرت کا سب سے روشن پہلو یہ ہے کہ آپ ﷺ نے بحیثیت ایک پیغمبر کے اپنے پیروؤں کو جو نصیحت فرمائی اس پر سب سے پہلے خود عمل کرکے دکھا دیا۔

آپ ﷺ نے لوگوں کو اللہ کی یاد اور محبت کی نصیحت کی۔ صحابۂ کرام رضی اللہ عنہم کی زندگی میں اس تلقین کا جو اثر نمایاں ہوا، وہ تو الگ چیز ہے، خود آپ ﷺ کی زندگی کہاں تک اس کے مطابق تھی، اس پر غور کرو۔ شب و روز میں کم کوئی ایسا لمحہ تھا جب آپ ﷺ کا دل اللہ کی یاد سے اور آپ ﷺ کی زبان اللہ کے ذکر سے غافل ہو۔ اٹھتے بیٹھتے، چلتے پھرتے، کھاتے پیتے، سوتے جاگتے، پہنتے اوڑھتے ہر حال میں ہر وقت اللہ کا ذکر اور اس کی حمد و ثنا زبان مبارک پر جاری رہتی تھی۔ آج حدیث کی کتابوں کا ایک بڑا حصہ انھی مبارک دعاؤں اور کلمات کے بیان میں ہے جو مختلف حالات اور مختلف وقتوں

[1] شمائل الترمذي، حديث:335.

کی مناسبت سے آپ ﷺ کی زبانِ فیض اثر سے ادا ہوئیں۔ حصن حصین دوسو صفحات کی کتاب صرف ان کلمات اور دعاؤں کا مجموعہ ہے جن کے فقرہ فقرہ سے اللہ کی محبت، عظمت، جلالت اور خشیت نمایاں ہوتی ہے اور جن سے ہر وقت زبان اقدس تر رہتی تھی۔ قرآن مجید نے اچھے بندوں کی یہ تعریف کی ہے:

''وہ لوگ جو کھڑے اور بیٹھے اور اپنے پہلوؤں پر (لیٹے ہر وقت) اللہ کو یاد کرتے ہیں۔''[1]

یہی آپ ﷺ کی زندگی کا نقشہ تھا، چنانچہ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کہتی ہیں کہ

''آپ ﷺ ہر وقت اور ہر لمحہ اللہ کی یاد میں مصروف رہتے تھے۔''[2]

آپ ﷺ نے لوگوں کو نماز کا حکم دیا مگر خود آپ ﷺ کا کیا حال تھا؟ عام لوگوں کو پانچ وقت کی نماز کا حکم تھا مگر خود آٹھ وقت نماز پڑھتے تھے۔ طلوع آفتاب کے بعد اشراق، کچھ اور دن چڑھنے پر چاشت، پھر ظہر، پھر عصر، پھر مغرب، پھر عشاء، پھر تہجد، پھر صبح۔ عام مسلمانوں پر تو صبح کو دو رکعتیں، مغرب کو تین اور بقیہ اوقات میں چار چار رکعتیں فرض ہیں۔ گویا کل شب و روز میں سترہ رکعتیں ہیں۔ مگر آپ ﷺ ہر روز کم وبیش پچاس ساٹھ رکعتیں ادا فرمایا کرتے تھے۔ پنج وقتہ نماز کی فرضیت کے بعد تہجد کی نماز عام مسلمانوں سے معاف ہوگئی تھی۔ مگر آپ ﷺ اس کو بھی تمام عمر ہر شب ادا فرمایا کرتے تھے اور پھر کیسی نماز کہ رات رات بھر کھڑے رہتے۔ کھڑے کھڑے پاؤں مبارک میں ورم آجاتا۔ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا عرض کرتیں: اس قدر کیوں تکلیف اٹھاتے ہیں! فرماتے:

[1] آلِ عمرٰن 3:191. [2] صحیح مسلم، حدیث: 373.

''اے عائشہ! کیا میں اللہ کا شکر گزار بندہ نہ بنوں۔''[1]

یعنی نماز خشیت الٰہی سے نہیں ہے بلکہ محبتِ الٰہی اس کا منشا ہے۔ رکوع میں اتنی دیر جھکتے رہتے کہ دیکھنے والے کہتے کہ شاید آپ سجدہ کرنا بھول گئے۔

نبوت کے آغاز ہی سے آپ ﷺ نماز پڑھتے تھے۔ کفار آپ ﷺ کے سخت دشمن تھے، مگر اس کے باوجود عین حرم میں جا کر سب کے سامنے نماز پڑھتے تھے۔ کئی دفعہ نماز کی حالت میں دشمنوں نے آپ ﷺ پر حملہ کیا مگر اس پر بھی اللہ کی یاد سے باز نہ آئے۔ سب سے سخت موقع نماز کا وہ ہوتا تھا جب کفار کی فوجیں مقابل ہوتیں۔ تیر و خنجر چلتے ہوتے لیکن ادھر نماز کا وقت آیا اور ادھر صفیں درست ہوگئیں۔ بدر کے معرکے میں تمام مسلمان دشمنوں کے مقابل کھڑے تھے مگر خود ذاتِ اقدس اللہ کے آگے سجدے میں جھکی ہوئی تھی۔ تمام عمر میں کوئی نماز، عموماً اپنے وقت سے نہیں ہٹی اور نہ دو وقتوں کے علاوہ کبھی کسی وقت کی نماز قضا ہوئی۔ ایک تو غزوۂ خندق میں کفار نے نمازِ عصر کا موقع نہ دیا اور ایک دفعہ کسی اور غزوے کے سفر میں رات بھر چل کر صبح کو تمام لوگ سو گئے تو آپ ﷺ نے بعد کو نماز قضا ادا کی۔ اس سے زیادہ یہ کہ مرض الموت میں شدت کا بخار تھا، بہت تکلیف تھی مگر نماز حتیٰ کہ جماعت بھی ترک نہ ہوئی۔ قوت جواب دے چکی تھی مگر دو صحابیوں کے کندھوں پر سہارا لے کر مسجد تشریف لائے۔ وفات سے تین دن پہلے جب آپ ﷺ نے اٹھنے کا قصد کیا تو غشی طاری ہوئی اور یہی حالت تین دفعہ پیش آئی۔ اس وقت نماز با جماعت ترک ہوئی۔ یہ تھا اللہ کی عبادت گزاری اور یاد کا عملی نمونہ۔

---

[1] صحيح البخاري، حديث:4837.

نبی ﷺ نے روزے کا حکم دیا۔ عام مسلمانوں پر سال میں تیس دن کے روزے فرض ہیں مگر خود آپ ﷺ کی کیفیت کیا تھی؟ کوئی ہفتہ اور کوئی مہینہ روزوں سے خالی نہیں جاتا تھا۔ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کہتی ہیں کہ جب آپ روزے رکھنے پر آتے تو معلوم ہوتا تھا کہ اب آپ ﷺ کبھی افطار نہ کریں گے۔[1] آپ ﷺ نے مسلمانوں کو دن بھر سے زیادہ روزہ رکھنے کی ممانعت فرمائی۔ مگر خود آپ ﷺ کا یہ حال تھا کہ کبھی دو دو، تین تین دن بیچ میں کچھ کھائے پیے بغیر روزہ رکھتے تھے اور اس عرصے میں ایک دانہ بھی منہ میں نہ جاتا تھا۔ صحابہ رضی اللہ عنہم اس کی تقلید کرنا چاہتے تو فرماتے: ''تم میں سے کون میرے مانند ہے؟ مجھ کو تو میرا رب کھلا تا پلاتا ہے۔''[2] سال میں دو مہینے شعبان اور رمضان پورے کے پورے روزوں میں گزرتے تھے۔ ہر مہینہ کے ایام بیض (13، 14، 15) میں اکثر روزے رکھتے تھے۔[3] محرم کے دس دن اور شوال کے 6 دن روزوں میں گزرتے۔[4] ہفتہ میں دو بار سوموار اور جمعرات کے دن روزے میں بسر ہوتے۔[5] یہ تھا روزوں کے متعلق آپ ﷺ کا عملی نقشۂ زندگی۔

آپ ﷺ نے لوگوں کو زکاۃ و خیرات کا حکم دیا تو پہلے خود اس پر عمل کر کے دکھایا۔ حضرت خدیجہ رضی اللہ عنہا کی شہادت تم سن چکے ہو کہ انھوں نے کہا: ''یا رسول اللہ ﷺ آپ قرض داروں کا قرض ادا کرتے ہیں، غریبوں اور مصیبت زدوں کی مدد کرتے ہیں۔''

---

[1] صحيح مسلم، حديث: 1156. [2] صحيح البخاري، حديث: 1965. [3] صحيح البخاري، حديث: 1981. [4] صحيح مسلم، حديث: 1164۔ محرم کے بارے میں آپ ﷺ کا فرمان گرامی کہ رمضان کے بعد افضل ترین روزے اللہ کے مہینے محرم کے ہیں، صحیح مسلم (1136) میں منقول ہے لیکن اس ماہ کے دس روزوں کے بارے میں آپ کا معمول مجھے نہیں ملا۔ (ط۔ج) [5] صحيح مسلم، حديث: 1162.

گو آپ ﷺ نے یہ نہیں فرمایا کہ تم سب کچھ چھوڑ کر میرے پیچھے آؤ، نہ گھر بار لٹانے کا حکم فرمایا، نہ آسمان کی بادشاہت کا دروازہ ہی دولت مند لوگوں پر بند کیا بلکہ صرف یہ حکم دیا کہ اپنی کمائی میں سے کچھ دوسروں کو دے کر اللہ کا حق ادا کرو: ﴿ وَمِمَّا رَزَقْنٰهُمْ يُنْفِقُوْنَ ۝ ﴾ مگر خود آپ کا عمل یہ رہا کہ جو کچھ آیا اللہ تعالیٰ کی راہ میں خرچ ہو گیا۔ غزوات اور فتوحات کی وجہ سے مال و اسباب کی کمی نہ تھی مگر وہ سب غیروں کے لیے تھا، اپنے لیے کچھ نہ تھا بلکہ وہی فقر و فاقہ تھا۔ فتح خیبر کے بعد، یعنی سات ہجری سے یہ معمول تھا کہ سال بھر کے خرچ کے لیے تمام ازواج مطہرات کو غلہ تقسیم کر دیا جاتا تھا۔ مگر سال ختم بھی نہیں ہونے پاتا تھا کہ غلہ تمام ہو جاتا تھا اور فاقہ پر فاقہ شروع ہو جاتا تھا کیونکہ غلے کا بڑا حصہ اہل حاجات کی نذر کر دیا جاتا تھا۔ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما کہتے ہیں کہ آپ ﷺ تمام لوگوں سے زیادہ سخی تھے اور سب سے زیادہ سخاوت آپ رمضان کے مہینہ میں فرماتے تھے۔[1] تمام عمر کسی سوالی کے جواب میں ''نہیں'' کا لفظ نہیں فرمایا۔ کبھی کوئی چیز تنہا نہیں کھاتے تھے۔ کتنی ہی تھوڑی چیز ہوتی مگر آپ ﷺ سب حاضرین کو اس میں شریک کر لیتے تھے۔ لوگوں کو عام حکم تھا کہ ''جو مسلمان قرض چھوڑ کر مر جائے اس کی اطلاع مجھے دو کہ میں اس کا قرض ادا کروں گا۔ اور اگر اس نے ترکہ چھوڑا ہو تو اس کے حق دار اس کے وارث ہوں گے۔''[2] ایک دفعہ ایک بدو نے آ کر کہا: ''اے محمد ﷺ! یہ مال تیرا ہے نہ تیرے باپ کا ہے۔ میرے اونٹ کو لاد دے۔'' آپ نے اس کے اونٹ کو جَو اور کھجوروں سے لدوا دیا اور اس کے کہے کا بُرا نہ مانا۔[3] کہ خود

① صحيح البخاري، حديث: 1902. ② سنن أبي داود، حديث: 2956. ③ سنن أبي داود، حديث: 4775.

فرمایا کرتے تھے:

«إِنَّمَا أَنَا قَاسِمٌ وَخَازِنٌ وَاللّٰهُ يُعْطِي»

''میں تو بانٹنے والے اور خزانچی کی حیثیت رکھتا ہوں، اصل دینے والا تو اللہ ہے۔''①

حضرت ابوذر رضی اللہ عنہ کہتے ہیں کہ ایک دفعہ رات کو میں آپ کے ساتھ ایک راستے سے گزر رہا تھا۔ راہ میں آپ ﷺ نے فرمایا: ''ابوذر! اگر اُحد کا یہ پہاڑ میرے لیے سونا ہو تو میں کبھی پسند نہ کروں گا کہ تین راتیں گزر جائیں اور اس میں سے ایک دینار بھی میرے پاس رہ جائے، البتہ یہ کہ کسی قرض کے ادا کرنے کے لیے کچھ رکھ چھوڑوں۔''②

دوستو! یہ محمد رسول اللہ ﷺ کے صرف خوشنما الفاظ نہ تھے بلکہ یہ آپ ﷺ کے عزم صادق کا اظہار تھا اور اسی پر آپ ﷺ کا عمل تھا۔ بحرین سے ایک دفعہ خراج کا لدا ہوا خزانہ آیا، فرمایا کہ صحن مسجد میں ڈال دیا جائے۔ صبح کی نماز کے لیے آپ ﷺ تشریف لائے تو دیکھنے والے کہتے ہیں کہ آپ نے خزانے کے انبار کی طرف نظر اٹھا کر بھی نہ دیکھا۔ نماز کے بعد ڈھیر کے پاس بیٹھ گئے اور تقسیم کرنا شروع کر دیا۔ جب سب ختم ہو گیا تو دامن جھاڑ کر اس طرح کھڑے ہو گئے کہ گویا یہ کوئی غبار تھا جو دامن مبارک پر پڑ گیا تھا۔③

ایک دفعہ فدک سے چار اونٹوں پر غلہ لد کر آیا۔ کچھ قرض تھا وہ ادا کیا گیا، کچھ لوگوں کو دیا گیا۔ حضرت بلال رضی اللہ عنہ سے دریافت کیا کہ ''بچ تو نہیں رہا؟'' عرض کی کہ اب

① صحيح البخاري، قبل الحديث: 3114. ② صحيح البخاري، حديث: 2388. ③ صحيح البخاري، حديث: 421.

کوئی لینے والا نہیں، اس لیے کچھ بچ گیا ہے۔ فرمایا: ''جب تک دنیا کا یہ مال باقی ہے میں گھر نہیں جا سکتا۔'' چنانچہ رات مسجد میں بسر کی۔ صبح کو حضرت بلال رضی اللہ عنہ نے آکر بشارت دی: یا رسول اللہ ﷺ! اللہ نے آپ کو سبکدوش کر دیا، یعنی جو کچھ تھا وہ تقسیم ہو گیا۔ آپ ﷺ نے اللہ کا شکر ادا کیا۔[1] ایک دفعہ عصر کی نماز کے بعد خلاف معمول فوراً اندر تشریف لے گئے اور پھر باہر آ گئے۔ لوگوں کو تعجب ہوا، فرمایا: ''مجھ کو نماز میں یاد آیا کہ سونے کا چھوٹا سا ٹکڑا گھر میں پڑا رہ گیا ہے۔ خیال ہوا کہ ایسا نہ ہو کہ رات آ جائے اور وہ محمد ﷺ کے گھر میں پڑا رہ جائے۔''[2] ام سلمہ رضی اللہ عنہا بیان کرتی ہیں کہ ایک دفعہ آپ ﷺ ملول اور رنجیدہ اندر تشریف لائے۔ میں نے سبب دریافت کیا، فرمایا: ''ام سلمہ! کل جو سات دینار آئے تھے، شام ہو گی اور وہ بستر پر پڑے رہ گئے۔'' اس سے بڑھ کر یہ کہ آپ ﷺ مرض الموت میں ہیں، بیماری کی سخت تکلیف ہے، نہایت ہی بے چینی ہے لیکن اسی وقت یاد آتا ہے کہ کچھ اشرفیاں گھر میں پڑی ہیں۔ حکم ہوتا ہے کہ انھیں خیرات کر دو، کیا محمد ﷺ اپنے رب سے اس طرح ملے گا کہ اس کے پیچھے اس کے گھر میں اشرفیاں پڑی ہوں۔''[3] یہ تھی آپ کی زندگی کی عملی مثال۔

نبی ﷺ نے زہد وقناعت کی تعلیم دی لیکن اس راہ میں آپ ﷺ کا طرزِ عمل کیا تھا؟ سن چکے ہو کہ عرب کے گوشہ گوشہ سے جزیہ، خراج، عشر اور زکاۃ وصدقات کے خزانے چلے آتے تھے مگر امیر عرب کے گھر میں وہی فقر تھا اور وہی فاقہ تھا۔ آپ ﷺ کی وفات کے بعد حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا کہا کرتی تھیں کہ نبی ﷺ اس دنیا سے

---

[1] سنن أبي داود، حديث: 3055. [2] السنن الكبرٰى للنسائي، حديث: 1288. [3] مسند أحمد: 104/6.

تشریف لے گئے مگر دو وقت بھی سیر ہو کر کھانا نصیب نہ ہوا۔[1] وہی بیان کرتی ہیں کہ جب آپ ﷺ نے وفات پائی تو گھر میں اس دن کے کھانے کے لیے تھوڑے سے جَو کے سوا کچھ موجود نہ تھا اور چند سیر جَو کے بدلے میں آپ ﷺ کی زرہ ایک یہودی کے ہاں رہن تھی۔[2] آپ ﷺ فرمایا کرتے تھے کہ "فرزند آدم کو ان چیزوں کے سوا اور کسی چیز کا حق نہیں: رہنے کو ایک جھونپڑا، تن ڈھانپنے کو ایک کپڑا، پیٹ بھرنے کو روکھی سوکھی روٹی اور پانی۔"[3] یہ محض الفاظ کی خوشنما بندش نہ تھی بلکہ یہی آپ کی طرزِ زندگی کا عملی نقشہ تھا۔ رہنے کا مکان ایک حجرہ تھا جس میں کچی دیوار اور کھجور کے پتوں اور اونٹ کے بالوں کی چھت تھی۔ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کہتی ہیں کہ آپ ﷺ کا کپڑا کبھی تہ کر کے نہ رکھا جاتا تھا، یعنی جو بدنِ مبارک پر کپڑا ہوتا تھا، اس کے سوا کوئی اور کپڑا ہی نہیں ہوتا تھا جو تہ کیا جاتا۔[4] ایک دفعہ ایک سائل خدمت اقدس میں آیا اور بیان کیا کہ سخت بھوکا ہوں۔ آپ نے ازواج مطہرات کے پاس کہلا بھیجا کہ کچھ کھانے کو ہو تو بھیج دیں! ہر جگہ سے یہی جواب آیا کہ گھر میں پانی کے سوا کچھ نہیں ہے۔"[5]
حضرت عمر رضی اللہ عنہ کہتے ہیں کہ ایک دن رسول اللہ ﷺ کو دیکھا کہ مسجد میں زمین پر لیٹے ہیں اور بھوک کی تکلیف سے کروٹیں بدل رہے ہیں۔[6] ایک دفعہ صحابہ رضی اللہ عنہم نے آپ کی خدمت میں فاقہ کشی کی شکایت کی اور پیٹ کھول کر دکھائے کہ ان پر ایک ایک پتھر بندھا ہے۔ آپ نے شکم مبارک کھولا تو ایک کی بجائے دو پتھر بندھے ہوئے تھے، یعنی دو دن سے فاقہ تھا۔[7] اکثر بھوک کی وجہ سے آواز میں کمزوری اور نقاہت آ جاتی تھی۔

[1] صحيح البخاري، حديث: 5416. [2] صحيح البخاري، حديث: 2069. [3] جامع الترمذي، حديث: 2341 (إسناده ضعيف). [4] سنن ابن ماجه، حديث: 3554. [5] صحيح البخاري، حديث: 3798. [6] صحيح مسلم، حديث: 2978. [7] جامع الترمذي، حديث: 2371.

ایک دن گھر سے نکلے تو بھوکے تھے۔ حضرت ابو ایوب انصاری رضی اللہ عنہ کے گھر تشریف لے گئے۔ وہ نخلستان سے کھجوریں توڑ لائے اور کھانے کا سامان کیا۔ کھانا جب سامنے آیا تو آپ ﷺ نے ایک روٹی پر تھوڑا سا گوشت رکھ کر فرمایا: ''یہ فاطمہ (رضی اللہ عنہا) کو بھجوا دو کہ اس کو کئی روز سے کھانا نصیب نہیں ہوا ہے۔''[1]

نبی ﷺ کو اپنی صاحبزادی حضرت فاطمہ رضی اللہ عنہا اور حضرت حسنین رضی اللہ عنہما سے بڑی محبت تھی۔ مگر یہ محبت امیر عرب نے بیش قیمت کپڑوں، سونے اور چاندی کے زیور کے ذریعے سے ظاہر نہیں فرمائی۔ ایک دفعہ حضرت علی رضی اللہ عنہ کا دیا ہوا ایک سونے کا ہار حضرت فاطمہ رضی اللہ عنہا کے گلے میں دیکھا تو فرمایا: ''اے فاطمہ تم کیا لوگوں سے یہ کہلوانا چاہتی ہو کہ محمد (ﷺ) کی بیٹی اپنے گلے میں آگ کا طوق ڈالے ہے۔'' حضرت فاطمہ رضی اللہ عنہا نے اسی وقت وہ ہار بیچ ڈالا اور اس کی قیمت سے ایک غلام خرید کر آزاد کیا۔[2] اسی طرح ایک دفعہ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا نے سونے کے کنگن پہنے تو اتروا دیے کہ محمد ﷺ کی بیوی کو یہ زیبا نہیں۔[3] فرمایا کرتے تھے کہ ''انسان کے لیے دنیا میں اتنا ہی کافی ہے جس قدر ایک مسافر کو زادِ راہ۔'' یہ قول تھا اور عمل یہ تھا کہ ایک دفعہ کچھ جانثار ملنے آئے تو دیکھا کہ پہلو میں چٹائی کے نشان پڑ گئے ہیں۔ عرض کی کہ یا رسول اللہ ﷺ! ہم لوگ ایک نرم گدّا بنا کر حاضر کرنا چاہتے ہیں۔ فرمایا مجھ کو کیا غرض دنیا سے؟ مجھ کو دنیا سے اسی قدر تعلق ہے جس قدر اس سوار کو جو راستہ چلتے تھوڑی دیر کے لیے کہیں سائے میں آرام کرتا ہے اور پھر آگے بڑھ جاتا ہے۔[4] 9ھ میں جب اسلام کی حکومت یمن

[1] صحیح ابن حبان، حدیث: 5216. [2] المستدرك للحاكم: 152/3. [3] المصنف لعبد الرزاق: 72,71/11. [4] جامع الترمذي، حديث: 2377.

سے شام تک پھیلی ہوئی تھی، آپ کے توشہ خانے کی مالیت یہ تھی: جسم اطہر پر ایک تہبند، ایک کھرّی چارپائی، سرہانے ایک تکیہ جس میں کھجور کی چھال بھری تھی، ایک طرف تھوڑے سے جَو، ایک کونے میں ایک جانور کی کھال، کھونٹی میں پانی کے مشکیزے۔ یہ تھا زہد وقناعت کی تعلیم کے ساتھ اس پر آپ ﷺ کا عمل۔

دوستو! ایثار کا وعظ کہنے والوں کو تم نے بہت دیکھا ہوگا مگر کیا کسی ایثار کے وعظ کہنے والے کے صحیفۂ سیرت میں اس کی مثال بھی دیکھی ہے۔ اس کی مثال مدینے کی گلیوں میں ملے گی۔ آپ ﷺ نے لوگوں کو ایثار کی تعلیم دی تو ساتھ ہی ان کے سامنے اپنا نمونہ بھی پیش کیا۔ حضرت فاطمہ رضی اللہ عنہا سے آپ کو جو محبت تھی وہ ظاہر ہے مگر انھی حضرت فاطمہ رضی اللہ عنہا کی عسرت اور تنگدستی کا یہ عالم تھا کہ چکی پیستے پیستے ہتھیلیاں گھس گئی تھیں اور مشک میں پانی بھر بھر کر لانے سے سینے پر نیل کے داغ پڑ گئے تھے۔ ایک دن انھوں حاضر ہو کر آپ ﷺ سے ایک خادمہ کی خواہش ظاہر کی۔ ارشاد ہوا: ”اے فاطمہ اب تک صفہ کے غریبوں کا انتظام نہیں ہوا ہے تو تمھاری درخواست کیونکر قبول ہو۔“[1] دوسری روایت میں ہے کہ فرمایا: ”فاطمہ! بدر کے یتیم تم سے پہلے درخواست کر چکے ہیں۔“[2] ایک دفعہ آپ ﷺ کے پاس چادر نہ تھی۔ ایک صحابیہ نے لاکر پیش کی۔ اسی وقت ایک صحابی نے کہا: کیسی اچھی چادر ہے! آپ ﷺ نے فوراً اتار کر ان کی نذر کردی۔[3] ایک صحابی کے گھر کوئی تقریب تھی مگر کوئی سامان موجود نہ تھا۔ ان سے کہا: ”عائشہ کے پاس جا کر آٹے کی ٹوکری مانگ لاؤ۔“ وہ گئے اور جا کر مانگ لائے، حالانکہ آپ ﷺ کے گھر اس آٹے کے سوا رات کے کھانے کو کچھ نہ تھا۔ ایک دن صفہ

[1] مسند أحمد: 79/1. [2] سنن أبي داود، حديث: 2987. [3] صحيح البخاري، حديث: 1277.

کے غریبوں کو لے کر حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کے گھر تشریف لائے اور فرمایا: ''جو کچھ کھانے کو ہو لاؤ'' چونی کا پکا ہوا کھانا حاضر کیا گیا، وہ کافی نہ تھا کوئی اور چیز طلب کی گئی تو چھوہارے کا حریرہ پیش ہوا، پھر پیالے میں دودھ آیا مگر یہی سامان مہمانی کی آخری قسط گھر میں تھی۔ یہ تھا ایثار اور اس پر عمل۔

اللہ پر اعتماد، توکل اور بھروسے کی شان دیکھنا ہو تو محمد رسول اللہ ﷺ میں دیکھو۔ حکم تھا کہ

﴿فَاصْبِرْ كَمَا صَبَرَ أُولُوا الْعَزْمِ مِنَ الرُّسُلِ﴾

''جس طرح اولوالعزم پیغمبروں نے صبر اور استقلال دکھایا تو بھی دکھا۔''[1]

آپ ﷺ نے وہی کر کے دکھا دیا۔ آپ ایک ایسی جاہل اور اَن پڑھ قوم میں پیدا ہوئے تھے جو اپنے معتقدات کے خلاف ایک لفظ بھی نہیں سن سکتی تھی اور اس کے لیے مرنے مارنے پر تیار ہو جاتی تھی مگر آپ ﷺ نے اس کی کبھی پروا نہ کی۔ عین حرم میں جا کر توحید کی آواز بلند کرتے اور وہاں سب کے سامنے نماز ادا کرتے تھے۔ حرم محترم کا صحن قریش کے رئیسوں کی نشست گاہ تھا۔ آپ ﷺ ان کے سامنے کھڑے ہو کر رکوع وسجود کرتے تھے۔ جب آیت

﴿فَاصْدَعْ بِمَا تُؤْمَرُ﴾

''اے محمد ﷺ! جو تم کو حکم دیا جاتا ہے اس کو علی الاعلان سنا دو۔''[2]

نازل ہوئی تو آپ ﷺ نے کوہِ صفا پر کھڑے ہو کر تمام قریش کو پکارا اور اللہ برحق کا حکم پہنچایا۔

---

[1] الأحقاف 35:46. [2] الحجر 94:15.

قریش نے آپ ﷺ کے ساتھ کیا کچھ نہ کیا۔ کس کس طرح اذیتیں نہیں پہنچائیں۔ جسم مبارک پر صحن حرم کے اندر نجاست ڈالی۔ گلے میں چادر ڈال کر پھانسی دینے کی کوشش کی۔ راستے میں کانٹے بچھائے مگر آپ کے قدم کو راہ حق سے لغزش نہ ہونی تھی نہ ہوئی۔ ابو طالب نے جب حمایت سے ہاتھ اٹھا لینے کا اشارہ کیا تو آپ ﷺ نے کس جوش اور ولولے سے فرمایا: ''چچا جان! اگر قریش میرے داہنے ہاتھ پر سورج اور بائیں ہاتھ پر چاند بھی رکھ دیں تب بھی میں اس فرض سے باز نہ آؤں گا۔''[1]

آخر آپ ﷺ کو مع بنی ہاشم کے پہاڑی درّے (شعب ابی طالب) میں تین سال تک گویا قید میں رکھا گیا۔ آپ ﷺ کا اور آپ ﷺ کے خاندان کا بائیکاٹ کیا گیا۔ اندر غلہ جانے کی روک تھام کی گئی۔ بچے بھوک سے بلبلاتے تھے جو درختوں کے پتے کھا کھا کر زندگی بسر کرتے تھے۔ آخر آپ ﷺ کے قتل کی سازش ہوئی۔ یہ سب کچھ ہوا مگر صبر واستقلال کا سررشتہ آپ ﷺ کے ہاتھ سے نہ چھوٹا۔ ہجرت کے وقت غارِ ثور میں پناہ لیتے ہیں۔ کفار آپ کا پیچھا کرتے ہیں اور غار کے منہ تک پہنچ جاتے ہیں۔ بے یارو مددگار نہتے محمد ﷺ اور مسلح قریش کے درمیان چند گز فاصلہ رہ جاتا ہے۔ حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ گھبرا اٹھتے ہیں کہ یارسول اللہ ﷺ! ہم دو ہی ہیں، لیکن ایک تسکین سے بھری ہوئی آواز آتی ہے: اے ابوبکر! ہم دو نہیں تین ہیں:

﴿ لَا تَحْزَنْ إِنَّ اللّٰهَ مَعَنَا ﴾

''گھبراؤ نہیں! ہمارا اللہ ہمارے ساتھ ہے۔''[2]

اسی ہجرت کے زمانے میں اثنائے راہ نبی ﷺ کی گرفتاری کے لیے سراقہ بن جعشم

[1] سيرة ابن هشام:266/1. [2] التوبة 30:9.

نیزہ ہاتھ میں لیے گھوڑا دوڑاتا ہوا آپ کے پاس پہنچ جاتا ہے۔ حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کہتے ہیں: یارسول اللہ ﷺ! ہم پکڑ لیے گئے۔ مگر وہاں محمد رسول اللہ ﷺ کے لب مبارک بدستور قرآن خوانی میں مصروف ہیں اور دل کے اطمینان کا وہی عالم ہے۔[1]

مدینہ پہنچ کر یہود کا، منافقین کا اور قریش کے غارت گروں کا ڈر تھا۔ لوگ آپ ﷺ کے مسکن کا راتوں کو پہرہ دیتے تھے کہ ایک دفعہ یہ آیت نازل ہوئی:

﴿ وَاللَّهُ يَعْصِمُكَ مِنَ النَّاسِ ﴾

''اللہ تجھ کو لوگوں سے بچائے گا۔''[2]

اسی وقت خیمے سے سر باہر نکال کر فرمایا: ''لوگو! واپس جاؤ! مجھے چھوڑ دو کہ میری حفاظت کی ذمے داری خود اللہ نے لے لی ہے۔''[3]

غزوۂ نجد سے واپسی میں آپ ﷺ ایک درخت کے نیچے آرام فرماتے ہیں۔ صحابہ رضی اللہ عنہم ادھر ادھر ہٹ گئے ہیں۔ ایک بدو تلوار کھینچ کر سامنے آتا ہے۔ آپ ﷺ بیدار ہوتے ہیں۔ موقع کی نزاکت کو دیکھو۔ بدو پوچھتا ہے: بتاؤ! اے محمد (ﷺ) اب کون تم کو میرے ہاتھ سے بچا سکتا ہے؟ اطمینان اور تسکین سے بھری ہوئی آواز آتی ہے کہ اللہ! اس پُراثر جواب سے دشمن متاثر ہوتا ہے اور تلوار نیام میں پہنچ جاتی ہے۔[4]

بدر کا معرکہ ہے۔ تین سو نہتے مسلمان، ایک ہزار لوہے میں غرق قریشی لشکر سے نبرد آزما ہیں۔ مگر ان تین سو سپاہیوں کا سپہ سالار خود کہاں ہے؟ معرکۂ کارزار سے الگ اللہ کی بارگاہ میں دست بدعا ہے، کبھی پیشانی زمین پر ہوتی ہے اور کبھی ہاتھ آسمان کی

[1] سيرة ابن هشام: 303/1. [2] المآئدة 5:67. [3] جامع الترمذي، حديث: 3046. [4] صحيح البخاري، حديث: 4135.

جانب اٹھتے ہیں کہ اے اللہ! اگر آج یہ چھوٹی سی جماعت صفحۂ ہستی سے مٹ گئی تو پھر کوئی تیرا پرستار اس دنیا میں باقی نہ رہے گا۔[1]

ایسے مواقع بھی آئے ہیں کہ مسلمانوں کے قدم اکھڑ گئے اور وہ پیچھے ہٹ گئے مگر اللہ کی نصرت اور مدد پر اعتمادِ کامل اور پورا بھروسہ رکھنے والا پہاڑ کی طرح اپنی جگہ پر قائم رہا۔ اُحد میں اکثر مسلمانوں نے قدم ہٹا لیے مگر رسول اللہ ﷺ اپنی جگہ پر تھے۔ پتھر کھائے، تیروں، تلواروں اور نیزوں کے حملے ہو رہے تھے۔ خَود کی کڑیاں سر مبارک میں دھنس گئیں تھیں، دندان مبارک شہید ہو چکا تھا۔ چہرۂ انور زخمی ہو رہا تھا مگر اس وقت بھی اپنا ہاتھ لوہے کی تلوار پر نہیں رکھا بلکہ اللہ تعالیٰ ہی کی نصرت پر بھروسہ اور اعتماد رہا کیونکہ اس کی حفاظت کی ذمہ داری کا پورا یقین تھا۔ حُنین کے میدان میں ایک دفعہ دس ہزار تیروں کا جب مینہ برسا تو تھوڑی دیر کے لیے مسلمان پیچھے ہٹ گئے۔ مگر ذات اقدس ﷺ اپنی جگہ پر تھی۔ ادھر سے تیروں کی بارش ہو رہی تھی۔ ادھر سے

«أَنَا النَّبِيُّ لَا كَذِبْ ، أَنَا ابْنُ عَبْدِالْمُطَّلِبْ»

''میں پیغمبر ہوں، جھوٹ نہیں ہے، میں عبدالمطلب کا بیٹا ہوں۔''[2]

نعرہ بلند تھا۔ سواری سے نیچے اتر آئے اور فرمایا: میں اللہ کا بندہ اور پیغمبر ہوں اور پھر دعا کے لیے ہاتھ اٹھا دیے۔

عزیزو! تمھیں کسی اور ایسے سپہ سالار کا حال بھی معلوم ہے جس کی بہادری اور استقلال کا یہ عالم ہو کہ فوج کتنی ہی کم ہو، کتنی ہی غیر مسلح ہو، وہ اس کو چھوڑ کر پیچھے بھی کیوں نہ ہٹ گئی ہو مگر وہ نہ تو اپنی جان بچانے کے لیے بھاگتا ہے اور نہ اپنی حفاظت

[1] صحيح مسلم، حديث: 1763. [2] صحيح البخاري، حديث: 4315.

کے لیے تلوار اٹھاتا ہے بلکہ ہر حال میں زمین کی طاقتوں سے غیر مسلح ہو کر آسمان کی طاقتوں سے مسلح ہونے کی درخواست کرتا ہے۔ یہ تھی اس راہ میں آپ ﷺ کی عملی مثال۔

تم نے دشمنوں کو پیار کرنے کا وعظ سنا ہوگا لیکن اس کی عملی مثال نہیں دیکھی ہوگی۔ آؤ مدینہ کی سرکار میں تم کو دکھاؤں۔ مکہ کے حالات چھوڑتا ہوں کہ میرے نزدیک محکومی، بے کسی اور معذوری عفو و درگزر اور رحم کے ہم معنی نہیں ہے۔ ہجرت کے وقت قریش کے رئیس یہ اشتہار دیتے ہیں کہ جو محمد ﷺ کا سر قلم کر کے لائے گا اس کو سو اونٹ انعام دیے جائیں گے۔ سراقہ بن جعشم اس انعام کے لالچ میں مسلح ہو کر آپ ﷺ کے تعاقب میں گھوڑا ڈالتا ہے اور قریب پہنچ جاتا ہے۔ حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ گھبرا جاتے ہیں۔ نبی ﷺ دعا کرتے ہیں، تین دفعہ گھوڑے کے پاؤں زمین میں دھنس جاتے ہیں۔ سراقہ تیر کے پانسے نکال کر فال دیکھتا ہے۔ ہر دفعہ جواب آتا ہے کہ ان کا پیچھا نہ کرو، نفسیاتی طور پر سراقہ مرعوب ہو جاتا ہے۔ واپسی کا عزم کر لیتا ہے اور نبی ﷺ کو آواز دیتا ہے اور خطِ امان کی درخواست کرتا ہے کہ جب آپ ﷺ کو اللہ قریش پر غالب کرے تو مجھ سے باز پرس نہ ہو۔ آپ ﷺ یہ امان لکھوا کر اس کے حوالے کرتے ہیں۔ فتح مکہ کے بعد وہ اسلام لاتا ہے تاہم آپ ﷺ اس سے یہ نہیں پوچھتے کہ سراقہ! تمھارے اس دن کے جرم کی اب کیا سزا ہو![1]

ابوسفیان کون ہے؟ وہ جو بدر، اُحد اور خندق وغیرہ لڑائیوں کا سرغنہ تھا جس نے کتنے مسلمانوں کو تہ تیغ کرایا۔ جس نے کتنی دفعہ خود سرور عالم ﷺ کے قتل کا فیصلہ کیا۔ جو ہر آن اور ہر قدم پر اسلام کا سخت ترین دشمن ثابت ہوا۔ لیکن فتح مکہ سے پہلے

[1] سیرة ابن هشام:2/490.

حضرت عباس رضی اللہ عنہ کے ساتھ آپ کے سامنے آتا ہے تو گو اس کا ہر جرم اس کے قتل کا مشورہ دیتا ہے مگر رحمت عالم ﷺ کا عفو عام ابوسفیان سے کہتا ہے کہ ڈر کا مقام نہیں۔ محمد ﷺ انتقام کے جذبے سے بالاتر ہیں۔ پھر نبی ﷺ نہ صرف اس کو معاف فرماتے ہیں بلکہ یہ بھی فرماتے ہیں:

«مَنْ دَخَلَ دَارَأَبِي سُفْيَانَ كَانَ آمِنًا»

''جو ابوسفیان کے گھر میں پناہ لے گا اس کو بھی امن ہے۔''[1]

ہند، ابوسفیان کی بیوی، وہ ہند جو اُحد کے معرکے میں اپنی سہیلیوں کے ساتھ گا گا کر قریش کے سپاہیوں کا دل بڑھاتی ہے۔ وہ جو نبی ﷺ کے سب سے محبوب چچا اور اسلام کے ہیرو حضرت حمزہ رضی اللہ عنہ کی لاش کے ساتھ بے ادبی کرتی ہے۔ ان کا سینہ چاک کرتی ہے۔ ان کے کان، ناک کاٹ کر ہار بناتی ہے۔ کلیجے کو نکال کر چبانا چاہتی ہے۔ لڑائی کے بعد اس منظر کو دیکھ کر آپ بے تاب ہو جاتے ہیں۔ وہ فتح مکہ کے دن نقاب پوش سامنے آتی ہے اور یہاں بھی گستاخی سے باز نہیں آتی لیکن نبی ﷺ پھر بھی کچھ تعرض نہیں فرماتے ہیں اور یہ بھی نہیں پوچھتے کہ تم نے یہ کیوں کیا۔ عفو عام کی یہ معجزانہ مثال دیکھ کر وہ پکار اُٹھتی ہے: اے محمد ﷺ! آج سے پہلے تمھارے خیمے سے زیادہ کسی خیمے سے مجھے نفرت نہ تھی، لیکن آج آپ کے خیمے سے زیادہ کسی کا خیمہ مجھے محبوب نہیں ہے۔[2]

وحشی، حضرت حمزہ رضی اللہ عنہ کا قاتل، فتح طائف کے بعد بھاگ کر کہیں چلا جاتا ہے اور جب وہ مقام بھی فتح ہو جاتا ہے تو کوئی دوسری جائے پناہ نہیں ملتی۔ لوگ کہتے ہیں:

[1] سيرة ابن هشام: 47/4. [2] صحيح البخاري، حديث: 3528.

وحشی! تم نے ابھی محمد ﷺ کو پہچانا نہیں ہے۔ تمھارے لیے خود محمد ﷺ کے آستانے سے بڑھ کر کوئی دوسری جائے امن نہیں ہے۔ وحشی حاضر ہو جاتا ہے۔ نبیِ کریم ﷺ دیکھتے ہیں اور آنکھیں نیچی کر لیتے ہیں۔ پیارے چچا کی شہادت کا منظر سامنے آجاتا ہے۔ آنکھیں اشکبار ہو جاتی ہیں۔ قاتل سامنے موجود ہے مگر صرف یہ ارشاد ہوتا ہے:

''وحشی! جاؤ میرے سامنے نہ آیا کرو کہ شہید چچا کی یاد تازہ ہو جاتی ہے۔''[1]

عکرمہ، اسلام، مسلمانوں اور محمد ﷺ کے سب سے بڑے دشمن، یعنی ابوجہل کے بیٹے تھے جس نے آپ کو سب سے زیادہ تکلیفیں پہنچائیں۔ وہ خود بھی اسلام کے خلاف لڑائیاں لڑ چکے تھے۔ مکہ جب فتح ہوا تو ان کو اپنے اور اپنے خاندان کے تمام جرم یاد تھے۔ وہ بھاگ کر یمن چلے گئے۔ ان کی بیوی جو مسلمان ہو چکی تھیں اور محمد رسول اللہ ﷺ کو پہچان چکی، وہ خود یمن چلی گئیں۔ عکرمہ کو تسکین دی اور ان کو لے کر مدینہ آئیں۔ نبی ﷺ کو ان کی آمد کی خبر ہوتی ہے تو ان کے خیر مقدم کے لیے اس تیزی سے اٹھتے ہیں کہ جسم مبارک پر چادر نہیں رہتی۔ پھر جوشِ مسرت سے فرماتے ہیں: «مَرْحَبًا بِالرَّاكِبِ الْمُهَاجِرِ!» ''اے مہاجر سوار تیرا آنا مبارک!''[2] غور کرو، یہ مبارک باد کس کو دی جا رہی ہے؟ یہ خوشی کس کے آنے پر ہے؟ یہ معافی نامہ کس کو عطا ہو رہا ہے؟ اس کو جس کے باپ نے آپ ﷺ کو مکہ میں سب سے زیادہ تکلیفیں پہنچائیں۔ جس نے آپ ﷺ کے جسم پر نجاست ڈلوائی۔ جس نے بحالت نماز آپ ﷺ پر حملہ کرنا چاہا۔ جس نے آپ ﷺ کے گلے میں چادر ڈال کر آپ ﷺ کو پھانسی دینا چاہی۔ جس نے دار الندوہ میں آپ ﷺ کے قتل کا مشورہ دیا۔ جس نے بدر

[1] المعجم الكبير للطبراني: 139/22. [2] جامع الترمذي، حديث: 2735.

کا معرکہ برپا کیا اور ہر قسم کی صلح کی تدبیر کو برہم کیا آج۔ اسی کی جسمانی یادگار کی آمد پر یہ مسرت اور شادمانی ہے۔

ہبار بن اسود وہ شخص ہے جو ایک حیثیت سے آپ ﷺ کی صاحبزادی زینب رضی اللہ عنہا کا قاتل ہے اور کئی شرارتوں کا مرتکب ہو چکا ہے۔ مکہ کی فتح کے موقع پر اس کا خون رائیگاں قرار دیا جاتا ہے۔ وہ چاہتا ہے کہ بھاگ کر ایران چلا جائے لیکن پھر کچھ سوچ کر سیدھا در دولت پر حاضر ہوتا ہے اور کہتا ہے: یا رسول اللہ ﷺ! میں بھاگ کر ایران چلا جانا چاہتا تھا لیکن مجھے آپ ﷺ کا رحم وکرم اور عفو وحلم یاد آیا۔ میں حاضر ہوں، میرے جرائم کی جو اطلاعات آپ کو ملی ہیں، وہ سب درست ہیں۔ اتنا سنتے ہی آپ ﷺ کی رحمت کا دروازہ کھل جاتا ہے اور دوست دشمن کی تمیز اٹھ جاتی ہے۔ [1]

عمیر بن وہب بدر کے بعد ایک قریشی رئیس کی سازش سے اپنی تلوار زہر میں بجھا کر مدینہ آتا ہے اور اس تاک میں رہتا ہے کہ موقع پا کر نعوذ باللہ آپ ﷺ کا کام تمام کر دے کہ اچانک وہ گرفتار ہو جاتا ہے۔ آپ ﷺ کے پاس لایا جاتا ہے۔ اس کا گناہ ثابت ہو جاتا ہے مگر وہ رہا کر دیا جاتا ہے۔ [2]

صفوان بن امیہ، یعنی وہ رئیس جس نے عمیر کو آپ ﷺ کے قتل کے لیے بھیجا تھا اور جس نے عمیر سے وعدہ کیا تھا کہ اگر تم اس مہم میں مارے گئے تو میں تمھارے اہل وعیال اور قرضہ کا ذمے دار ہوں۔ فتح مکہ کے بعد وہ ڈر کر جدہ بھاگ جاتا ہے کہ سمندر کے راستے یمن چلا جائے۔ وہی عمیر خدمت نبوی ﷺ میں آ کر عرض کرتا ہے کہ یا رسول اللہ ﷺ! صفوان اپنے قبیلے کا رئیس ڈر کی وجہ سے بھاگ گیا ہے کہ اپنے کو

[1] المغازي للواقدي: 2/281. [2] سيرة ابن هشام: 2/661-662.

سمندر میں ڈال دے۔ ارشاد ہوتا ہے: ''اس کو امان ہے۔'' عمیر دوبارہ گزارش کرتے ہیں کہ اس امان کی کوئی نشانی مرحمت ہو کہ اس کو یقین آئے۔ آپ ﷺ اپنا عمامہ اتھا کر دے دیتے ہیں۔ عمیر یہ عمامہ لے کر صفوان کے پاس پہنچتے ہیں۔ صفوان کہتا ہے: مجھے محمد (ﷺ) کے پاس جانے میں اپنی جان کا خوف ہے۔ وہ عمیر جو زہر میں تلوار بجھا کر محمد ﷺ کو مارنے گئے تھے، صفوان سے کہتے ہیں: اے صفوان! ابھی تم کو محمد ﷺ کے حلم اور عفو کا حال معلوم نہیں ہے۔ صفوان آستانۂ نبوی ﷺ پر حاضر ہوتا ہے اور کہتا ہے: مجھ سے کہا گیا ہے کہ آپ نے مجھے امان دی ہے، کیا یہ سچ ہے؟ ارشاد ہوتا ہے: سچ ہے۔ پھر کہتا ہے: لیکن میں تمھارا دین ابھی قبول نہیں کروں گا، مجھے دو مہینے کی مہلت دو۔ آپ ﷺ فرماتے ہیں: تمھیں دو نہیں چار مہینے کی مہلت ہے لیکن یہ مہلت ختم بھی نہیں ہونے پاتی کہ دفعتاً اس کے دل کی کیفیت بدل جاتی ہے اور وہ مسلمان ہو جاتا ہے۔[1]

آپ ﷺ خیبر جاتے ہیں جو یہودی قوت کا سب سے بڑا مرکز ہے۔ لڑائیاں ہوتی ہیں، شہر فتح ہوتا ہے۔ ایک یہودیہ دعوت کرتی ہے۔ آپ ﷺ بلا پس و پیش قبول فرماتے ہیں۔ یہودیہ جو گوشت پکاتی ہے اس میں زہر ملا ہوتا ہے۔ آپ ﷺ گوشت کا ٹکڑا منہ میں رکھتے ہیں کہ آپ ﷺ کو اطلاع ہو جاتی ہے۔ یہودیہ بلائی جاتی ہے۔ وہ اپنے قصور کا اعتراف کرتی ہے لیکن رحمت عالم ﷺ کے دربار سے اس کو کوئی سزا نہیں ملتی، حالانکہ اس زہر کا اثر آپ کو اس کے بعد عمر بھر محسوس ہوتا رہا۔[2]

غزوۂ نجد سے واپسی کے وقت آپ ﷺ تنہا ایک درخت کے نیچے آرام فرما رہے

[1] سنن أبي داود، حديث:4508. [2] سنن أبي داود، حديث:4508.

ہیں۔ دوپہر کا وقت ہے۔ آپ ﷺ کی تلوار درخت سے لٹک رہی ہے۔ صحابہ رضی اللہ عنہم ادھر ادھر درختوں کے سائے میں لیٹے ہیں، کوئی پاس نہیں ہے۔ ایک بدو تاک میں رہتا ہے۔ وہ اس وقت سیدھا آپ ﷺ کے پاس آتا ہے۔ درخت سے آپ ﷺ کی تلوار اتارتا ہے، پھر نیام سے باہر کھینچتا ہے کہ آپ ﷺ کی آنکھ کھل جاتی ہے۔ وہ تلوار ہلا کر پوچھتا ہے: محمد (ﷺ)! بتاؤ اب کون تم کو مجھ سے بچا سکتا ہے؟ ایک پُر اطمینان صدا آتی ہے: ''اللہ''۔ اس غیر متوقع جواب کو سن کر وہ مرعوب ہو جاتا ہے۔ تلوار نیام میں کر لیتا ہے۔ صحابہ رضی اللہ عنہم آ جاتے ہیں۔ بدو بیٹھ جاتا ہے اور آپ اس کو کوئی سزا نہیں دیتے۔[1]

ایک دفعہ ایک کافر گرفتار ہو کر آتا ہے کہ یہ قتل کے لیے آپ ﷺ کی گھات میں تھا۔ وہ سامنے پہنچتا ہے تو آپ ﷺ کو دیکھ کر ڈر جاتا ہے۔ آپ ﷺ اس کو تسلی دیتے ہیں اور فرماتے ہیں کہ اگر تم قتل کرنا چاہتے تب بھی نہیں کر سکتے تھے۔[2] غزوۂ مکہ میں اسّی آدمیوں کا دستہ گرفتار ہوا جو جبل تنعیم سے اتر کر آپ ﷺ کو قتل کرنا چاہتا تھا۔ آپ ﷺ کو خبر ہوئی تو فرمایا: ''ان کو چھوڑ دو۔''[3]

دوستو! طائف کو جانتے ہو۔ طائف جس نے مکہ کے عہدِ ستم میں آپ کو پناہ نہیں دی۔ جس نے آپ کی بات بھی سننی نہیں چاہی۔ جہاں کے رئیس عبد یالیل کے خاندان نے آپ سے بُرا سلوک کیا۔ بازاریوں کو اشارہ کیا کہ وہ آپ کی ہنسی اڑائیں۔ شہر کے اوباش ہر طرف سے ٹوٹ پڑے اور دو رویہ کھڑے ہو گئے۔ جب آپ ﷺ بیچ سے گزرے تو دونوں طرف سے پتھر برسائے یہاں تک کہ پائے مبارک زخمی ہو گئے اور دونوں جوتیاں خون سے بھر گئیں۔ جب آپ ﷺ تھک کر بیٹھ جاتے تو یہ شریر

[1] صحيح البخاري، حديث: 4135. [2] مسند أحمد: 471/3. [3] صحيح مسلم، حديث: 1808.

آپ ﷺ کا بازو پکڑ کر اٹھا دیتے ۔ جب آپ ﷺ چلنے لگتے تو پھر پتھر برساتے۔ آپ ﷺ کو اس دن اس قدر تکلیف پہنچی کہ نو برس کے بعد جب حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا نے ایک دن دریافت کیا کہ یارسول اللہ ﷺ ! تمام عمر میں آپ پر سب سے زیادہ سخت دن کون سا آیا؟ تو آپ ﷺ نے اسی طائف کا حوالہ دیا تھا۔[1]

8ھ میں مسلمانوں کی فوج اسی طائف کا محاصرہ کرتی ہے۔ ایک مدت تک محاصرہ جاری رہتا ہے۔ قلعہ فتح نہیں ہوتا، بہت سے مسلمان شہید ہوتے ہیں۔ آپ ﷺ واپسی کا ارادہ کرتے ہیں۔ پُر جوش مسلمان نہیں مانتے، طائف پر بددعا کرنے کی درخواست کرتے ہیں۔ آپ ﷺ ہاتھ اٹھاتے ہیں مگر کیا فرماتے ہیں: ''اے اللہ! طائف کو ہدایت کر اور اس کو اسلام کے آستانے پر جھکا۔''[2] دوستو! یہ کس شہر کے حق میں دعائے خیر ہے۔ وہی شہر جس نے آپ پر پتھر برسائے تھے۔ آپ ﷺ کو زخمی کیا تھا اور آپ ﷺ کو پناہ دینے سے انکار کیا تھا۔

اُحد کے غزوے میں دشمن حملہ کرتے ہیں۔ مسلمانوں کے پاؤں اکھڑ جاتے ہیں۔ آپ ﷺ دشمنوں کے نرغے میں آجاتے ہیں۔ آپ ﷺ پر پتھر، تیر اور تلوار کے وار ہو رہے ہیں۔ دندانِ مبارک شہید ہوتا ہے۔ خود کی کڑیاں سر مبارک میں گڑ جاتی ہیں۔ چہرۂ مبارک خون سے رنگین ہوتا ہے۔ اس حالت میں بھی آپ ﷺ کی زبان پر یہ الفاظ آتے ہیں: ''وہ قوم کیسے نجات پائے گی جو اپنے نبی کے قتل کے درپے ہے۔ اے اللہ! میری قوم کو ہدایت کر کہ وہ جانتی نہیں ہے۔''[3] یہ ہے ''تو اپنے دشمن کو پیار کر''

[1] صحيح البخاري، حديث:3231. [2] سيرة ابن هشام: 131/4. [3] شعب الإيمان للبيهقي، حديث:1447،1448.

کے زیتونی وعظ پر عمل۔ جو صرف شاعرانہ فقرہ نہیں بلکہ عمل کا خطرناک نمونہ ہے۔

وہی ابن عبدیالیل جس کے خاندان نے طائف میں آپ ﷺ کے ساتھ یہ مظالم کیے تھے، جب طائف کا وفد لے کر مدینہ آتا ہے تو آپ ﷺ اس کو اپنی مقدس مسجد میں خیمہ گاڑ کر اتارتے ہیں۔[1] ہر روز نماز عشاء کے بعد اس کی ملاقات کو جاتے ہیں اور اپنی رنج بھری مکے کی داستان سناتے ہیں۔ کس کو؟ اس کو جس نے آپ پر پتھر برسائے تھے اور آپ کو ذلیل کیا تھا۔ یہ ہے ”تو اپنے دشمن کو پیار کر اور معاف کر۔“

مکہ جب فتح ہوا تو حرم کے صحن میں، کس حرم کے صحن میں جہاں آپ ﷺ کو گالیاں دی گئیں۔ آپ پر نجاستیں پھینکی گئیں۔ آپ کے قتل کی تجویز منظور ہوئی۔ قریش کے تمام سردار مفتوحانہ کھڑے تھے۔ ان میں وہ بھی تھے جو اسلام کے مٹانے میں ایڑی چوٹی کا زور لگا چکے تھے۔ وہ بھی تھے جو آپ کی تذلیل کیا کرتے تھے۔ وہ بھی تھے جو آپ کو گالیاں دیا کرتے تھے۔ جو آپ پر پتھر پھینکتے تھے۔ آپ کے راستے میں کانٹے بچھاتے تھے۔ وہ بھی تھے جو خود اس پیکر قدسی کے ساتھ گستاخیوں کا حوصلہ رکھتے تھے، وہ بھی تھے جو آپ کو جھٹلایا کرتے تھے۔ وہ بھی تھے جنھوں نے آپ ﷺ پر تلواریں چلائیں تھیں۔ وہ بھی تھے جنھوں نے آپ کے عزیزوں کا خونِ ناحق کیا تھا۔ ان کے سینے چاک کیے تھے اور ان کے دل و جگر کے ٹکڑے کیے تھے۔ وہ بھی تھے جو غریب و بے کس مسلمانوں کو ستاتے تھے۔ ان کے سینوں پر اپنی جفا کاری کی آتشیں مہریں لگاتے تھے۔ ان کو جلتی ریتوں پر لٹاتے تھے۔ دہکتے کوئلوں سے ان کے جسم داغتے تھے۔ نیزوں کی انی سے ان کے بدن کو چھیدتے تھے۔ آج یہ سب مجرم سرنگوں

[1] زاد المعاد:3/499.

سامنے تھے۔ پیچھے دس ہزار خون آشام تلواریں محمد رسول اللہ ﷺ کے ایک اشارے کی منتظر تھیں۔ دفعتاً زبانِ مبارک کھلتی ہے۔ سوال ہوتا ہے: ''قریش! بتاؤ میں آج تمھارے ساتھ کیا سلوک کروں؟'' جواب ملتا ہے: محمد (ﷺ) تو ہمارا شریف بھائی اور شریف بھتیجا ہے۔ارشاد ہوتا ہے: ''آج میں وہی کہتا ہوں جو یوسف علیہ السلام نے اپنے ظالم بھائیوں سے کہا تھا:

لَا تَثْرِيْبَ عَلَيْكُمُ الْيَوْمَ ''آج کے دن تم پر کوئی الزام نہیں۔'' اِذْهَبُوْا فَأَنْتُمُ الطُّلَقَاءُ ''جاؤ تم سب آزاد ہو۔''[1]

یہ ہے دشمنوں کو پیار کرنا اور معاف کرنا۔ یہ ہے اسلام کے پیغمبر ﷺ کا عملی نمونہ اور عملی تعلیم جو صرف خوش بیانیوں اور شیریں زبانیوں تک محدود نہیں بلکہ دنیا میں واقعہ اور عمل بن کر ظاہر ہوئی ہے۔

یہی نکتہ ہے جس کے باعث تمام دوسرے مذاہب اپنے پیغمبروں اور رہنماؤں کے میٹھے میٹھے الفاظ کی طرف دنیا کو بلاتے ہیں اور بار بار انھی کو دہراتے ہیں کہ ان کے سوا ان کے پاس کوئی چیز نہیں۔ اسلام اپنے پیغمبر کے صرف الفاظ نہیں بلکہ عمل اور سنت کی دعوت دیتا ہے۔ نبی ﷺ نے دنیا سے رخصت ہوتے وقت فرمایا تھا:

«تَرَكْتُ فِيكُمُ الثَّقَلَيْنِ كِتَابَ اللّٰهِ وَسُنَّتِي»

''میں تم میں دو مرکزِ ثقل چھوڑے جاتا ہوں، اللہ کی کتاب اور اپنا عملی راستہ۔''[2]

یہی دونوں مرکزِ ثقل اب تک قائم ہیں اور تا قیامت قائم رہیں گے۔اسی لیے اسلام

① طبقات ابن سعد: 142/2، وسيرة ابن هشام: 55/4. ② الإلماع في ضبط الرواية وتقييد السماع، ص: 9,8.

کتاب اللہ کے ساتھ ساتھ اپنے پیغمبر کی سنت کی پیروی کی بھی دعوت دیتا ہے:

﴿لَقَدْ كَانَ لَكُمْ فِي رَسُولِ اللَّهِ أُسْوَةٌ حَسَنَةٌ﴾

”(لوگو!) تمھارے لیے اللہ کے رسول ﷺ کی زندگی میں بہتر پیروی ہے۔“[1]

اسلام خود اپنے پیغمبر کو اپنی کتاب کا عملی نمونہ اور پیکر بنا کر پیش کرتا ہے۔ تمام دنیا میں یہ فکر صرف اسلام کے پیغمبر کو حاصل ہے کہ وہ تعلیم اور اصولوں کے ساتھ ساتھ اپنے عمل اور اپنی مثال کو پیش کرتا ہے۔ طریقۂ نماز کے ناواقف سے کہتا ہے:

«صَلُّوْا كَمَا رَأَيْتُمُوْنِي أُصَلِّي»

”تم اس طرح (اللہ کی) نماز پڑھو جس طرح مجھے پڑھتے ہوئے دیکھتے ہو۔“[2]

بیوی بچوں کے ساتھ نیکی اور بھلائی کی تعلیم ان الفاظ میں دیتا ہے:

«خَيْرُكُمْ خَيْرُكُمْ لِأَهْلِهِ وَ أَنَا خَيْرُكُمْ لِأَهْلِي»

”تم میں سب سے اچھا وہ ہے جو اپنے بیوی بچوں کے لیے سب سے اچھا ہے اور میں اپنے بیوی بچوں کے لیے تم سب سے اچھا ہوں۔“[3]

آخری حج کا موقع ہے، شمعِ نبوت کے گرد ایک لاکھ پروانوں کا ہجوم ہے۔ انسانوں کو اللہ کا آخری پیغام سنایا جا رہا ہے۔ عرب کے باطل رسوم اور نہ ختم ہونے والی لڑائیوں کا سلسلہ آج توڑا جا رہا ہے۔ مگر تعلیم کے ساتھ ساتھ دیکھو کہ اپنی ذاتی نظیر اور عملی مثال بھی ہر قدم پر پیش کی جا رہی ہے۔ فرمایا:

” آج عرب کے تمام انتقامی خون باطل کر دیے گئے، یعنی تم سب ایک دوسرے کے قاتلوں کو معاف کرو اور سب سے پہلے میں اپنے خاندان کا خون اپنے بھتیجے ربیعہ

[1] الأحزاب 21:33. [2] صحيح البخاري، حديث:631. [3] جامع الترمذي، حديث:3895.

بن حارث کے بیٹے کا خون معاف کرتا ہوں۔

جاہلیت کے تمام سودی لین دین اور کاروبار آج باطل کیے جاتے ہیں اور سب سے پہلے میں اپنے چچا عباس بن عبدالمطلب کا سودی بیوپار توڑتا ہوں۔''[1]

جان اور مال کے بعد تیسری چیز آبرو ہے۔ وہ غلط اور قابلِ اصلاح رسوم و رواج جن کا تعلق لوگوں کی عزت اور آبرو سے ہوتا ہے، ان کو سب سے پہلے عملاً مٹانے کی ہمت گویا بظاہر اپنی بے عزتی اور بے آبروئی کے ہم معنی ہے، اسی لیے ملک کے بڑے بڑے مصلحین کے پاؤں بھی کسی ملکی رسم و رواج کی عملی اصلاح کی جرأت مشکل سے کرتے ہیں۔ محمد ﷺ نے لوگوں کو مساوات کی تعلیم دی۔ عرب میں سب سے زیادہ ذلیل غلام سمجھے جاتے تھے۔ آپ ﷺ نے مساوات، اخوتِ انسانی اور جنسِ انسانی کی برابری کی یہ عملی مثال پیش کی کہ ایک غلام کو اپنا فرزند متبنیٰ بنایا۔

عرب میں قبائل کی باہمی شرافت کی زیادتی اور کمی کا اس درجہ لحاظ تھا کہ لڑائی میں بھی اپنے سے کم رتبہ والے پر تلوار چلانا عار سمجھا جاتا تھا کہ ذلیل خون اس کی شریف تلوار کو ناپاک نہ کر دے، لیکن آپ نے جب یہ اعلان کیا کہ'' اے لوگو! تم سب آدم کے بیٹے ہو اور آدم مٹی سے بنا تھا۔ کالے کو گورے پر، گورے کو کالے پر، عجمی کو عربی پر اور عربی کو عجمی پر کوئی فضیلت نہیں، تم میں افضل وہ ہے جو اپنے رب کے نزدیک سب سے زیادہ پرہیزگار ہے۔''[2]

اس تعلیم نے دفعتاً بلند و پست، بالا و زیر، اعلیٰ و ادنیٰ، آقا و غلام سب کو ایک سطح پر لا کھڑا کر دیا۔ لیکن ضرورت تھی عملی مثالوں کی۔ یہ مثال خود آپ ﷺ نے پیش کی۔ اپنی

[1] صحیح مسلم، حدیث: 1218. [2] شرح العقیدۃ الطحاویۃ، حدیث: 461.

پھوپھی زاد بہن کو جو قریش کے شریف خاندان سے تھیں، اپنے غلام سے بیاہا۔ منہ بولے بیٹے کا قاعدہ جب اسلام میں توڑا گیا تو سب سے پہلے زید بن محمد، زید بن حارثہ کہلائے۔ منہ بولے بیٹے کی مطلقہ بیوی سے نکاح عرب میں ناجائز تھا مگر چونکہ یہ محض لفظی رشتہ تھا جس کو واقعیت سے کوئی تعلق نہ تھا اور اس رسم سے بہت سی خاندانی رقابتوں اور خرابیوں کی بنیاد عربوں میں قائم ہو گئی تھی، اس لیے اس کا توڑنا ضروری تھا لیکن اس کے توڑنے کے لیے عملی مثال پیش کرنا انسان کی سب سے عزیز چیز آبرو سے تعلق رکھتا تھا جو سب سے مشکل کام تھا۔ پیغمبر دو جہاں ﷺ نے آگے بڑھ کر خود اس کی مثال پیش کی اور زید بن حارثہ کی مطلقہ بیوی حضرت زینب رضی اللہ عنہا سے شادی کر لی۔ جب ہی سے یہ رسم عرب سے ہمیشہ کے لیے مٹ گئی اور تبنّٰی کی بیہودہ رسم سے ملک نے نجات پائی۔

واقعات کی انتہا نہیں ہے، مثالوں کی کمی نہیں ہے، وقت محدود ہے۔ آج شاید میں نے سب سے زیادہ آپ کا وقت لیا ہے۔

میرے دوستو! میری گزارشات کی روشنی میں آدم علیہ السلام سے لے کر عیسیٰ علیہ السلام تک اور شام سے لے کر ہندوستان تک، ہر ایک تاریخی انسان کی مصلحانہ زندگی پر ایک نظر ڈالو، کیا ایسی عملی ہدایتوں اور کامل مثالوں کا کوئی نمونہ کہیں نظر آتا ہے؟

بعض شیریں بیان واعظ شاعرانہ پیرائے میں اپنے ''خداوند'' کی ربانی محبت اور الٰہی عشق کا تذکرہ کرتے ہیں۔ مگر انھی کے مقولے کے مطابق کہ'' درخت اپنے پھل سے پہچانا جاتا ہے'' اس پاک عشق و محبت کا کیا اثر ان کی زندگی میں نمایاں تھا؟ عرب کے دعویدارِ محبت کی سیرت پڑھو، راتیں گزرتی ہیں، دنیا سوتی ہے اور اس کی آنکھیں

جاگتی ہیں۔ ہاتھ اللہ کے آگے پھیلے ہیں، زبان ترانۂ حمد گارہی ہے، دل پہلو میں بے تاب تڑپ رہا ہے اور آنکھوں سے آنسوؤں کے تار جاری ہیں۔ کیا محبت کی یہ تصویر ہے یا وہ؟

حضرت عیسیٰ علیہ السلام سولی پر چڑھتے ہیں تو بے تابانہ زبان سے یہ الفاظ نکلتے ہیں: ایلی ایلی لما شبقتنی ''اے میرے خداوند! اے میرے خداوندا! تو نے مجھے کیوں چھوڑ دیا؟''[1]

لیکن حضرت محمد رسول اللہ ﷺ جب موت کے بستر پر ہوتے ہیں اور زندگی کی آخری سانسیں لیتے ہوتے ہیں تو زبان پر یہ کلمہ ہوتا ہے:

«اَللّٰهُمَّ الرَّفِيقَ الْأَعْلٰى»

''اے میرے اللہ! اے میرے بہترین ساتھی۔''[2]

ان دونوں فقروں میں سے کس میں محبت کا ذائقہ، عشق کی چاشنی اور ربانی اطمینان کا لطف ہے؟

---

[1] انجیلِ متّی، باب 27، آیت 46. [2] صحیح مسلم، حدیث: 2444.

سیرت نبوی ﷺ کا پیغام

حضرات! میں نے اب تک کی گفتگو میں دلائل اور تاریخ کی روشنی میں یہ ثابت کر دیا ہے کہ انسانوں کے تمام بلند طبقوں میں سے صرف انبیاء علیہم السلام کی سیرتیں تقلید اور پیروی کے لائق ہیں اور ان میں سے عالم گیر اور دائمی نمونہ صرف محمد ﷺ کی سیرت ہے۔ اس مقام پر جب یہ ثابت ہو جاتا ہے کہ محمد ﷺ ہی عالمگیر اور دائمی نمونہ ہیں تو سوال پیدا ہوتا ہے کہ ان کی عالمگیر اور دائمی تعلیم کیا ہے؟ وہ دنیا کو کیا پیغام دینے آئے؟ اور کیا پیغام دے کر دنیا سے تشریف لے گئے؟ ان کے پیغام کے وہ کون سے ضروری اجزاء ہیں جن کے ادا کرنے کے لیے اس پیغمبر آخر الزمان ﷺ کی ضرورت پیش آئی۔ دنیا میں دوسرے پیغمبروں کے ذریعے سے جو پیغام آئے ان کی کس طرح اس آخری پیغمبر نے تصحیح اور تکمیل کی؟

ہم کو تسلیم ہے کہ دنیا میں وقتاً فوقتاً انبیاء کے ذریعے سے پیغام آتے رہے مگر جیسا کہ بار بار کہا جا چکا ہے اور واقعات کی روشنی میں دکھایا جا چکا ہے، وہ تمام پیغام کسی خاص زمانہ اور قوم کے لیے آیا۔ وہ وقتی تھا، اس لیے ان کی دائمی حفاظت کا سامان نہ ہوا، ان کی اصل برباد ہوگئی۔ مدتوں کے بعد مرتب کیے گئے اور ان میں تبدیلیاں کی

گئیں۔ ان کے ترجموں نے ان کو کچھ سے کچھ بنا دیا۔ ان کی تاریخی سند کا ثبوت باقی نہیں رہا۔ بہت سے جعلی پیغام ان میں شریک کیے گئے اور یہ سب چند سو برس کے اندر ہوگیا۔ اگر اللہ کا کام مصلحت اور حکمت سے خالی نہیں ہوتا تو ان کا مٹنا اور برباد ہو جانا ہی ان کے وقتی فرمان اور عارضی تعلیم ہونے کا ثبوت ہے مگر جو پیغام محمد رسول اللہ ﷺ کے ذریعے آیا، وہ عالمگیر اور دائمی ہوکر آیا۔ اسی لیے وہ جب سے آیا اب تک پوری طرح محفوظ ہے اور رہے گا کیونکہ اس کے بعد پھر کوئی نیا پیغام آنے والا نہیں ہے۔ اللہ تعالیٰ نے کسی گزشتہ پیغام کے متعلق یہ نہیں فرمایا کہ اس کی تکمیل ہوچکی اور اس کی حفاظت کا ذمہ دار میں ہوں۔ دنیا کے تمام وہ صحیفے جو گم ہوچکے، ان کا گم ہو جانا ہی ان کے وقتی اور عارضی ہونے کی دلیل ہے اور جو موجود ہیں ان کی ایک ایک آیت تلاش کرلو ان کی تکمیل اور ان کی حفاظت کے وعدہ کے متعلق ایک حرف نہ پاؤ گے بلکہ ان کے خلاف ان کے نقص کے اشارے اور تبدیلیاں ملیں گی۔

حضرت موسیٰ علیہ السلام کہتے ہیں کہ ”خداوند! تیرا خدا تیرے لیے تیرے ہی درمیان سے، یعنی تیرے ہی بھائیوں میں سے میری مانند ایک نبی برپا کرے گا۔ تم اس کی سننا۔“[1]

آگے فرماتے ہیں:

”میں ان کے لیے ان ہی کے بھائیوں میں سے تیری مانند ایک نبی برپا کروں گا اور اپنا کلام اس کے منہ میں ڈالوں گا اور جو کچھ میں اسے حکم دوں گا، وہی یہ ان سے کہے گا۔“[2]

[1] استثنا: باب 18، آیت: 15. [2] استثنا: باب 18، آیت 19.

اور مرد خدا موسیٰ نے جو دعائے خیر دے کر اپنی وفات سے پہلے بنی اسرائیل کو برکت دی وہ یہ ہے۔ اور اس نے کہا:

''خداوند! سینا سے آیا۔ اور شعیر سے ان پر آشکارا ہوا۔ وہ کوہِ فاران سے جلوہ گر ہوا۔ اور لاکھوں قدسیوں میں سے آیا۔ اس کے داہنے ہاتھ پر ان کے لیے آتشی شریعت تھی۔''[1]

ان اوپر کی آیتوں میں تورات یہ صاف بتارہی ہے کہ ایک اور نبی موسیٰ علیہ السلام کے مثل آنے والا ہے جو اپنے ساتھ ایک آتشی شریعت بھی لائے گا اور اس کے منہ میں خدا اپنا کلام بھی ڈالے گا۔ اس سے بالکل واضح ہے کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام کا پیغام آخری اور دائمی نہ تھا۔

ان کے بعد یسعیاہ نبی ایک اور ''رسول'' کی خوشخبری سناتے ہیں جن کی شریعت کی راہ دریائی ممالک اور جزیرے تک رہے ہیں۔[2] ملاکی میں ہے: ''دیکھو میں اپنے رسول کو بھیجوں گا۔''[3] بنی اسرائیل کے دیگر صحیفوں اور زبور میں بھی آیندہ آنے والوں کی بشارتیں ہیں۔ ان سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ کوئی بھی اسرائیلی صحیفہ دائمی، آخری اور مکمل نہیں تھا۔

انجیل کو دیکھو وہ اعلان کرتی ہے:

''اور میں باپ سے درخواست کروں گا تو وہ تمھیں دوسرا مددگار بخشے گا کہ اَبد تک تمھارے ساتھ رہے۔''[4]

---

[1] استثنا: باب 33، آیت 2,1. [2] یسعیاہ باب 42، آیت 5. [3] ملاکی، باب 3، آیت 1.

[4] یوحنا: باب 14، آیت 16.

”لیکن مددگار، یعنی روح القدس جسے باپ میرے نام سے بھیجے گا وہی تمھیں سب باتیں سکھائے گا اور جو کچھ میں نے تم سے کہا ہے وہ سب تمھیں یاد دلائے گا۔“①

”مجھے تم سے اور بھی بہت سی باتیں کہنا ہیں، مگر اب تم ان کو برداشت نہیں کر سکتے لیکن جب وہ، یعنی روحِ حق آئے گا تو تم کو تمام سچائی کی راہ دکھائے گا۔ اس لیے کہ وہ اپنی طرف سے نہ کہے گا، لیکن جو کچھ سنے گا، وہی کہے گا اور تمھیں آیندہ کی خبریں دے گا۔“②

ان آیتوں میں انجیل نے صاف اعلان کیا ہے کہ وہ اللہ کا آخری پیغام نہیں اور وہ کامل بھی نہیں۔ ایک اور آئے گا جو مسیح کے پیغام کی تکمیل کرے گا مگر محمد ﷺ کا پیغام اپنے بعد کسی اور آنے والے کا پیغام نہیں دیتا جو نیا پیغام سنائے گا یا محمد ﷺ کے پیغام میں کوئی نقص ہے کہ جس کو دور کر کے وہ اس کو کامل کرے گا بلکہ وہ اپنی تکمیل کا آپ دعویٰ کرتا ہے:

﴿ اَلْيَوْمَ اَكْمَلْتُ لَكُمْ دِيْنَكُمْ وَاَتْمَمْتُ عَلَيْكُمْ نِعْمَتِيْ ﴾

”آج میں نے تمھارے لیے تمھارا دین کامل کر دیا اور تم پر اپنی نعمت پوری کر دی۔“③

اور بتایا کہ محمد خاتم الانبیاء ﷺ، یعنی نبوت کے سلسلے کو بند کرنے والے ہیں۔ ﴿ وَخَاتَمَ النَّبِيّٖنَ ﴾④ خود قرآن نے کہا ہے۔ اور «خُتِمَ بِيَ النَّبِيُّونَ» ”اور میری

① یوحنا: باب 14، آیت 26. ② یوحنا: باب 16، آیت 13,12. ③ المآئدة 5:3. ④ الأحزاب 33:40.

ذات سے انبیاء ختم کیے گئے''[1] حدیث نے کہا ہے۔«أَلَا لَا نَبِيَّ بَعْدِيْ» ''خبردار! میرے بعد کوئی نبی نہیں''[2] متعدد حدیثوں میں ہے۔ آپ ﷺ نے فرمایا: ''میں نبوت کی عمارت کا آخری پتھر ہوں۔''[3]

قرآن مجید نے اپنے صحیفے کی کسی آیت میں کسی بعد میں آنے والے پیغمبر کے لیے کوئی جگہ نہیں چھوڑی ہے۔ اس سے معلوم ہوا کہ صرف وہی پیغام ربانی جو حضرت محمد رسول اللہ ﷺ کے ذریعے دنیا میں آیا، اللہ کا آخری اور دائمی پیغام ہے اور اسی لیے ﴿وَاِنَّا لَهٗ لَحٰفِظُوْنَ﴾[4] کے وعدے سے اللہ نے اس کی حفاظت کی ذمے داری خود لے لی ہے۔

دوستو! اس کے بعد سوال یہ ہے کہ پیغام محمدی ﷺ کے سوا کوئی اور پیغامِ الٰہی بھی عالمگیر ہو کر آیا؟ بنی اسرائیل کے نزدیک دنیا صرف بنی اسرائیل سے عبارت ہے۔ اللہ صرف بنی اسرائیل کا اللہ ہے۔ اسی لیے بنی اسرائیل کے انبیاء اور صحیفوں نے کبھی غیر بنی اسرائیل تک اللہ کا پیغام نہیں پہنچایا اور اب تک بھی یہودی مذہب اور موسوی شریعت بنی اسرائیل تک محدود ہے۔ تمام صحیفوں میں صرف انھی کو خطاب کیا گیا ہے اور ان کو ان کے خاندانی خدا کی طرف ہمیشہ متوجہ کیا گیا ہے۔ حضرت عیسیٰ علیہ السلام نے بھی اپنا پیغام بنی اسرائیل کی کھوئی ہوئی بھیڑوں تک محدود رکھا اور غیر اسرائیل کو اپنا پیغام سنا کر ''بچوں کی روٹی کتوں کو دینی پسند نہ کی۔'' ہندوستان کے وید بھی غیر آریوں کے کانوں تک نہیں پہنچ سکتے کہ ان کے علاوہ تو تمام دنیا شودر ہے اور وہاں یہ تاکید ہے کہ

---

[1] صحيح مسلم، حديث: 523. [2] جامع الترمذي، حديث: 3730. [3] صحيح مسلم، حديث: 2287. [4] الحجر 9:15.

اگر وید کے شبد شودر کے کانوں میں پڑ جائیں تو اس کے کانوں میں سیسہ ڈال دیا جائے۔

پیغام محمدی ﷺ دنیا میں اللہ کا پہلا اور آخری پیغام ہے جو کالے، گورے، عرب وعجم ترک وتاتار، ہندی وچینی، زنگ وفرنگ سب کے لیے عام ہے۔ جس طرح اس کا اللہ تمام دنیا کا اللہ ہے: ﴿ اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعٰلَمِيْنَ ﴾ ''سب تعریفیں اللہ ہی کے لیے ہیں جو تمام دنیا کا پروردگار ہے۔'' اسی طرح اس کا رسول تمام دنیا کا رسول ﴿ رَحْمَةً لِّلْعٰلَمِيْنَ ﴾ ''تمام دنیا کے لیے رحمت ہے۔'' اور اس کا پیغام بھی تمام دنیا کے لیے ہے۔ ارشاد ہوا:

﴿ اِنْ هُوَ اِلَّا ذِكْرٰى لِلْعٰلَمِيْنَ ﴾

''یہ تو تمام جہانوں کے لیے ایک نصیحت کے سوا کچھ نہیں۔''①

دوسرے مقام پر فرمایا:

﴿ تَبٰرَكَ الَّذِيْ نَزَّلَ الْفُرْقَانَ عَلٰى عَبْدِهٖ لِيَكُوْنَ لِلْعٰلَمِيْنَ نَذِيْرًا ۝ الَّذِيْ لَهٗ مُلْكُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ ﴾

''برکت والا ہے وہ (اللہ) جس نے اپنے بندے پر فیصلہ کرنے والی کتاب اتاری تاکہ وہ تمام دنیا کو خبردار کرنے والا ہو۔ وہ (اللہ) کہ اسی کی ہے سلطنت آسمانوں اور زمین کی۔''②

آپ تمام دنیا کے لیے نذیر ہو کر آئے۔ جہاں تک اللہ کی سلطنت ہے وہاں تک آپ کی پیغمبری کی وسعت ہے۔ سورۂ اعراف میں ہے:

﴿ قُلْ يٰٓاَيُّهَا النَّاسُ اِنِّيْ رَسُوْلُ اللّٰهِ اِلَيْكُمْ جَمِيْعَا ِۨ الَّذِيْ لَهٗ مُلْكُ

① الأنعام 90:6. ② الفرقان 25:1،2.

السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ﴾

''کہہ دیجیے اے لوگو! میں تم سب کی طرف (اس) اللہ کا رسول ہوں جس کی آسمانوں اور زمین کی سلطنت ہے۔''①

دیکھو اس آیت میں بھی پیغام محمدی ﷺ کی وسعت ساری کائنات تک بتائی جاتی ہے۔ اس سے زیادہ یہ کہ جہاں تک اس پیغام کی آواز پہنچ سکے، سب اس کے دائرے میں ہے۔ ارشاد الٰہی ہے:

﴿وَاُوْحِیَ اِلَیَّ هٰذَا الْقُرْاٰنُ لِاُنْذِرَكُمْ بِهٖ وَمَنْۢ بَلَغَ﴾

''اور میری طرف یہ قرآن وحی کیا گیا ہے تاکہ اس سے میں تم کو خبردار کروں اور جس تک یہ پہنچے اس کو (خبردار کروں)۔''②

اور بالآخر:

﴿وَمَآ اَرْسَلْنٰكَ اِلَّا كَآفَّةً لِّلنَّاسِ بَشِيْرًا وَّنَذِيْرًا﴾

''اور ہم نے نہیں بھیجا تم کو (اے محمد ﷺ) لیکن تمام انسانوں کے لیے خوشخبری سنانے والا اور خبردار کرنے والا (بنا کر)۔''③

ان حوالوں سے یہ امر پوری طرح ثابت ہوتا ہے کہ سارے مذہبوں میں صرف اسلام نے اپنے دائمی، آخری، کامل اور عالمگیر ہونے کا دعویٰ کیا ہے۔ صحیح مسلم میں ہے کہ آپ ﷺ نے فرمایا:

''مجھ سے پہلے تمام انبیاء صرف اپنی اپنی قوم کی طرف بھیجے گئے اور میں تمام قوموں کی طرف بھیجا گیا ہوں۔''④

① الأعراف 158:7. ② الأنعام 19:6. ③ سبا 28:34. ④ صحیح مسلم، حدیث: 521.

یہ ہمارے دعویٰ کا مزید ثبوت ہے اور تاریخ کی عملی شہادت ہماری تائید میں ہے۔

الغرض پیغام محمدی ﷺ بھی اسی طرح کامل، دائمی اور عالمگیر ہے جس طرح اس پیغام کے لانے والے کی سیرت اور اس کا عملی نمونہ کامل، دائمی اور عالمگیر ہے۔

اب سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ اس کامل، دائمی اور عالمگیر پیغمبر کا آخری، دائمی اور عالمگیر پیغام کیا ہے جس نے تمام مذاہب کی تکمیل کی اور ہمیشہ کے لیے اللہ کے دین کو مکمل اور اللہ کی نعمت کو تمام کر دیا۔

ہر مذہب کے دو جز ہیں۔ ایک کا تعلق انسان کے دل سے ہے اور دوسرے کا انسان کے باقی جسم اور مال و دولت سے ہے۔ پہلے کو ایمان اور دوسرے کو عمل کہتے ہیں۔ عمل کے تین حصے ہیں۔ ایک اللہ کے متعلق ہے جس کو عبادات کہتے ہیں۔ دوسرا انسان کے باہمی کاروبار کے متعلق ہے جس کو معاملات کہتے ہیں اور جن کا بڑا حصہ قانون ہے۔ تیسرا انسان کے باہمی روابط و تعلقات کی بجا آوری سے ہے، اس کو اخلاق کہتے ہیں۔ غرض اعتقادات، عبادات، معاملات اور اخلاق مذہب کے یہی چار جُز ہیں اور یہ چاروں جز پیغام محمدی ﷺ کے ذریعے تکمیل کو پہنچے ہیں۔

تورات اور انجیل میں عقائد کا حصہ بالکل ناصاف اور غیر واضح ہے۔ اس میں اللہ کے وجود اور توحید کا بیان ہے لیکن دلیلوں اور ثبوتوں سے خالی۔ اللہ کی صفات جو اصل میں روح انسانی کی تازگی کا ذریعہ ہیں اور جن کے ذریعے سے اللہ کی معرفت اور محبت حاصل ہوسکتی ہے، نہ تورات میں ہیں اور نہ انجیل میں ہیں۔ توحید کے بعد رسالت ہے۔ رسالت اور نبوت کی حقیقت، وحی، الہام، انبیاء علیہم السلام کی حیثیت انسانی، انبیاء علیہم السلام کا ہر قوم میں ہونا، انبیاء علیہم السلام کے فرائض، انبیاء علیہم السلام کو کس حیثیت سے تسلیم کرنا

چاہیے۔ انبیاء علیہم السلام کی معصومیت۔ ان تمام مسائل سے پیغام محمدی ﷺ سے پہلے کے تمام پیغامات خالی ہیں۔ جزا وسزا، دوزخ وجنت، حشر ونشر، قیامت وحیاتِ آخرت، تورات میں ان کے نہایت دھندلے سے نشانات ہیں۔ انجیل میں ایک یہودی کے جواب میں ان اہم امور کے متعلق ایک دوفقرے ملتے ہیں۔ ایک دوفقرے جنت ودوزخ کے متعلق بھی ہیں اور بس! لیکن پیغام محمدی ﷺ میں ہر چیز صاف اور تفصیل سے موجود ہے۔

فرشتوں کا تخیل توارت میں بھی ہے مگر بالکل غیر واضح، کبھی کبھی اللہ واحد اور فرشتوں میں تمیز مشکل ہوجاتی ہے کہ تورات میں اللہ کا ذکر ہورہا ہے یا فرشتوں کا۔ انجیل میں ایک دوفرشتوں کے نام آتے ہیں۔ وہاں روح القدس کی حقیقت اس قدر مشتبہ ہے کہ نہ اس کو فرشتہ کہہ سکتے ہیں نہ الہ یا یوں کہو کہ اس کو فرشتہ بھی کہہ سکتے ہیں اور الہ بھی۔ لیکن پیغام محمدی ﷺ میں ملائکہ اور فرشتوں کی حقیقت بالکل واضح ہے۔ اس میں ان کی حیثیت مقرر کردی گئی ہے، ان کے کام بتادیے گئے ہیں۔ اللہ سے، پیغمبروں سے اور کائنات سے ان کا تعلق کھول کر بتادیا گیا ہے۔

یہ تو وہ تکمیل ہے جو عقائد اور ایمانیات میں پیغام محمدی ﷺ نے کی ہے۔ اب آیئے عملیات کا امتحان لیں۔ عملیات کا پہلا حصہ عبادات ہے۔ تورات میں قربانی کی طویل بحث اوراس کے شرائط و آداب کی بڑی تشریح ہے۔ روزوں کا بھی ذکر آیا ہے۔ دعائیں بھی کی گئی ہیں۔ بیت ایل یا بیت اللہ کا نام بھی آتا ہے۔ لیکن یہ تمام چیزیں اس قدر دھندلی ہیں کہ ان پر لوگوں کی نظر بھی نہیں پڑتی اور وہ ان کے انکار کی طرف مائل ہیں، پھر نہ تو عبادات کی تقسیم ہے اور نہ ان کے طریقے اور آداب بتائے

گئے ہیں، نہ ان کے اوقات کی صاف صاف تعیین کی گئی ہے اور نہ اللہ کی یاد اور دعاؤں کی با قاعدہ تعلیم دی گئی ہے، نہ کوئی دعا بندے کو سکھائی گئی ہے۔

زبور میں اللہ کی دعائیں اور مناجاتیں بکثرت ہیں مگر عبادات کے طریقے، آداب، اوقات اور دیگر شرائط کا پتہ نہیں۔ انجیل میں عبادات کا بہت کم بلکہ بالکل ذکر نہیں ہے۔ ایک جگہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے چالیس دن کے فاقہ کا ذکر ہے، اس کو روزہ کہہ لو۔ یہودیوں کا یہ اعتراض بھی انجیل ہی میں ہے کہ ''کیوں تیرے شاگرد روزے نہیں رکھتے۔'' سولی والی رات میں دعا کرنے کا ذکر ہے اور وہیں ایک دعا بھی سکھائی گئی ہے مگر اور عبادات کا وہاں نشان نہیں۔ لیکن اسلام کے پیغام میں ہر چیز صاف اور تفصیل سے ہے۔ نماز، روزہ، حج، زکاۃ، ان کے آداب و شرائط، عبادات کے طریقے، اللہ کے ذکر اور یاد کی دعائیں اور مؤثر دعائیں، نماز کے اوقات، روزے کے اوقات، حج کے اوقات، ہر ایک کے احکام اور اللہ کے حضور میں بندوں کی عجز وانکسار، دعا ومناجات، گناہوں کا اقرار، توبہ وندامت اور عبد و معبود کے باہمی راز و نیاز کی وہ تعلیمات دی گئی ہیں جو روح کی غذا ہیں اور جو دلوں کی گرہیں کھولتی ہیں۔ جو انسانوں کو اللہ تک پہنچا دیتی ہیں۔

عمل کا دوسرا حصہ معاملات یا مملکت و معاشرت کے قوانین کا ہے۔ یہ حصہ حضرت موسیٰ علیہ السلام کے پیغام میں بڑی تفصیل کے ساتھ موجود ہے اور پیغام محمدی ﷺ نے ان کو بڑی حد تک قائم رکھا ہے لیکن ان قوانین کی سختی کم کردی ہے اور ایک قومی قانون کے تنگ دائرے سے نکال کر اس کو عالمگیر قانون کی حیثیت دے دی ہے۔ اس حیثیت سے جن تکمیلی اجزاء کی ضرورت تھی ان کا اضافہ کیا گیا ہے۔ زبور اور انجیل اس شریعت

اور قانون سے بالکل خالی ہیں۔ طلاق وغیرہ کے متعلق ایک دو احکام انجیل میں البتہ ہیں باقی صفر۔ مگر عالمگیر اور دائمی مذہب کی ضرورتوں کی کفالت کے لیے مملکت اور معاشرت کے قوانین کی حاجت تھی اور چونکہ پیغام عیسوی ان سے خالی تھا، اس لیے دیکھو کہ عیسائی قوموں کو یہ چیزیں بت پرست، یونانی اور رومی قوموں سے قرض لینی پڑیں۔ پیغام محمدی ﷺ نے ان میں ہر ایک حصے کو پوری باریک بینی کے ساتھ تکمیل کو پہنچایا اور ایسے اصول اور قواعد بتائے جن سے وقتاً فوقتاً ائمۂ مجتہدین اور علماء نئی نئی ضرورتوں کے لیے مسائل نکال کر پیش کرتے ہیں۔ کم از کم ایک ہزار برس تک اسلام نے دنیا میں حکمرانی کی اور سیکڑوں متمدن اور مہذب سلطنتیں قائم کیں، ان سب کا اسی قانون پر عملدرآمد رہا اور اب بھی اس سے بہتر قانون دنیا پیش نہیں کر سکتی۔

عمل کا تیسرا حصہ اخلاق ہے۔ توارت میں اخلاق کے متعلق چند احکام پائے جاتے ہیں۔ ان میں سے سات اصولی احکام ہیں جن میں سے والدین کی فرمان برداری کی ایک ایجابی تعلیم کی سوا دیگر چھ تعلیمات یہ ہیں کہ تو خون مت کر، تو چوری نہ کر، تو زنا نہ کر، اپنے ہمسائے پر جھوٹی گواہی نہ دے، تو اپنے ہمسائے کی جورو کو مت چاہ، تو اپنے ہمسائے کے مال کا لالچ نہ کر۔ ان میں سے چھٹا حکم چوتھے میں اور ساتواں تیسرے میں داخل ہے۔ اس لیے چار ہی اخلاقی احکام رہ گئے۔

انجیل میں بھی انھی احکام کو دہرایا گیا ہے۔ اور مختصر طور پر دوسروں کے ساتھ محبت کرنے کی بھی تعلیم دی گئی ہے جس کو تورات کے احکام پر ایک اضافہ کہہ لیجیے۔ لیکن پیغام محمدی ﷺ نے اس قطرے کو دریا کر دیا ہے۔ سب سے پہلے اس نے اپنے بارہ اصولی احکام متعین کیے جو معراج میں اللہ تعالیٰ کی بارگاہ سے عطا ہوئے تھے اور جو

سورۂ بنی اسرائیل میں مذکور ہیں۔ ان بارہ میں سے گیارہ انسانی اخلاق اور ایک توحید کے متعلق ہے۔

ماں باپ کی عزت اور فرمان برداری کر۔ جن کا تجھ پر حق ہے ان کا حق ادا کر۔ یتیم سے اچھا برتاؤ کر۔ ناپ تول، ترازو اور پیمانہ ٹھیک رکھ۔ اپنا وعدہ پورا کر کہ تجھ سے اس کی پوچھ گچھ ہوگی۔ تو اپنی اولاد کو قتل نہ کر۔ تو ناحق کسی کی جان نہ لے۔ زنا کے قریب نہ جا۔ انجان بات کے پیچھے نہ چل۔ زمین پر غرور نہ کر۔ فضول خرچی نہ کر بلکہ اعتدال اور بیچ کی راہ اختیار کر۔ انھی اصولی احکام کے مقابلے سے واضح ہوا ہوگا کہ پیغام محمدی ﷺ کیونکر تکمیلی پیغام ہو کر آیا ہے۔ یہ ''عمل'' کی وہ تکمیل تھی جو پیغام محمدی ﷺ کے ذریعے سے انجام پائی۔

اسلامی تعلیمات کے وسیع سلسلے کو اگر ہم دو مختصر لفظوں میں ادا کرنا چاہیں تو ہم ان کو ایمان اور عمل صالح کے دو لفظوں سے تعبیر کر سکتے ہیں۔ ایمان اور عمل یہی دو چیزیں ہیں جو ہر قسم کے محمدی پیغام پر حاوی ہیں اور قرآن مجید میں انھی دو چیزوں پر انسانی نجات کا مدار ہے، یعنی یہ کہ ہمارا ایمان پاک اور مستحکم ہو اور عمل نیک اور صالح ہو۔ ﴿الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ﴾ قرآن مجید میں کئی جگہ آیا ہے اور ہر جگہ صاف کھول کھول کر بیان کیا ہے کہ فلاح اور کامیابی صرف ایمان اور عمل صالح پر منحصر ہے۔ میں چاہتا تھا کہ ان دونوں اصولی مسئلوں کو پوری تشریح کے ساتھ آپ کے سامنے رکھ دوں۔ مگر افسوس کہ یہ موقع نہیں ہے کہ یہاں ان کی پوری تفصیل پیش کی جا سکے۔ اس لیے اس وقت پیغام محمدی ﷺ کا صرف وہ حصہ پیش کیا جاتا ہے جس نے ایمان و عمل کے متعلق تمام دنیا کی غلطیوں کی اصلاح کی اور دینِ ناقص کو تکمیل کے درجہ تک پہنچایا

اور ان اصولی اور بنیادی غلطیوں کو دور کیا جن کی بنا پر انسانیت حد درجہ پستی اور گمراہی میں تھی۔ وہ غلطیاں ہر قسم کی گمراہیوں کی بنیاد اور جڑ تھیں۔

① ان بنیادی مسائل میں سب سے پہلا مسئلہ جو پیغام محمدی ﷺ کے ذریعے سامنے آیا، وہ کائنات اور مخلوقاتِ الٰہی میں انسانیت کا درجہ ہے اور یہی توحید کی جڑ ہے۔ اسلام سے پہلے انسان اکثر مخلوقات الٰہی سے اپنے کو کم درجہ رتبہ سمجھتا تھا۔ وہ سخت پتھر، اونچے پہاڑ، بہتے دریا، سرسبز درخت، برستے پانی، دہکتی آگ، ڈراؤنے جنگل، زہریلے سانپ، دھاڑتے شیر، دودھ دیتی گائے، چمکتے سورج، درخشاں ستاروں، کالی راتوں، بھیانک صورتوں، غرض دنیا کی ہر اس چیز کو جس سے وہ ڈرتا تھا یا جس سے نفع کا خواہشمند تھا، پوجتا تھا اور اس کے آگے سر جھکاتا تھا۔ محمد رسول اللہ ﷺ نے آکر دنیا کو یہ پیغام دیا کہ اے لوگو! یہ تمام چیزیں تمھاری آقا نہیں بلکہ تم ان کے آقا ہو۔ وہ تمھارے لیے پیدا کی گئی ہیں، تم ان کے لیے پیدا نہیں کیے گئے، وہ تمھارے آگے جھکی ہیں، تم کیوں ان کے آگے جھکتے ہو؟ اے انسانو! تم اس کائنات میں اللہ کے نائب اور خلیفہ ہو، اس لیے یہ ساری مخلوقات اور کائنات تمھارے زیر فرمان کی گئی ہے۔ تم اس کے زیر فرمان نہیں کیے گئے، وہ تمھارے لیے ہے تم اس کے لیے نہیں ہو۔ ارشاد ہوا:

”(یاد کرو) جب تیرے رب نے فرشتوں سے کہا تھا کہ میں زمین میں اپنا نائب بنانے والا ہوں۔“①

دوسرے مقام پر فرمایا:

”اور اسی (اللہ) نے تم کو اپنا نائب بنایا ہے۔“②

① البقرة2:30. ② الأنعام6:165.

اسی نیابت اور خلافت نے آدم علیہ السلام اور اولادِ آدم کو سب مخلوقات میں عزت اور بزرگی بخشی۔ فرمایا:

﴿ وَلَقَدْ كَرَّمْنَا بَنِيٓ اٰدَمَ ﴾

''اور ہم نے بلاشک وشبہ آدم کی اولاد کو بزرگ بنایا۔''[1]

اوراب کیا یہ بزرگ ہوکر اپنے سے پست تر اور حقیر تر کے آگے سر جھکائے؟ اسلام نے انسانوں کو یہ سمجھایا کہ یہ ساری دنیا تمھارے لیے بنائی گئی ہے:

''کیا تم نے نہیں دیکھا کہ اللہ نے جو کچھ زمین میں ہے تمھارے بس میں دے دیا ہے۔''[2]

ایک اور جگہ فرمایا:

''اسی نے تمھارے لیے زمین میں جو کچھ ہے، بنایا۔''[3]

جانوروں کو تمھارے فائدے کے لیے پیدا کیا۔ فرمایا:

﴿ وَالْاَنْعَامَ خَلَقَهَا ۚ لَكُمْ فِيْهَا دِفْءٌ وَّمَنَافِعُ ﴾

''اور جانوروں کو تمھارے لیے پیدا کیا، ان کی اون میں گرمی اور دوسرے فائدے ہیں۔''[4]

بارش اور اس سے اُگنے والی سبزیاں اور درخت تمھارے لیے ہیں۔ فرمایا:

''اسی (اللہ) نے آسمان سے تمھارے لیے پانی اتارا، اس میں سے کچھ تم پیتے ہو اور کچھ سے درخت اُگتے ہیں جس میں تم جانور چراتے ہو۔ وہی (اللہ) تمھارے لیے کھیتی اور زیتون اور چھوہارے اور انگور اور ہر قسم کے پھل اگاتا ہے۔''[5]

① بنیٓ إسرآء یل 70:17. ② الحج 9:22. ③ البقرة 29:2. ④ النحل 5:16. ⑤ النحل 11,10:16.

رات، دن، چاند، سورج اور ستارے سب تمھارے لیے ہیں۔فرمایا:

''اور اس نے رات اور دن اور چاند اور سورج کو تمھارے لیے کام میں لگایا اور ستارے اس کے حکم سے کام میں لگے ہیں۔''[1]

دریا اور اس کی روانی بھی تمھارے لیے ہے۔ارشادِ ربانی ہے:

''اور وہی (اللہ) ہے جس نے دریا کو کام میں لگایا ہے تاکہ تم اس سے تازہ گوشت کھاؤ اور اس سے آرائش کے موتی پہننے کو نکالو اور تم دیکھتے ہو کہ کشتیاں سمندر کو پھاڑتی ہوئی چلتی ہیں اور تاکہ تم اللہ کی مہربانی کو ڈھونڈو اور شاید کہ تم اس کا شکر کرو۔''[2]

اس معنی کی بہت سی اور آیتیں قرآن مجید میں ہیں۔

ان آیتوں کے ذریعے پیغام محمدی ﷺ نے یہ واضح کردیا کہ انسان کائنات کا سرتاج ہے۔ وہ خلافت الٰہی سے ممتاز ہے، وہ خلق کائنات کا مقصود ہے اور ﴿وَلَقَدْ كَرَّمْنَا بَنِيٓ اٰدَمَ﴾[3] اس کا امتزاج ہے۔غور کرو کہ اس حقیقت کے فاش ہونے کے بعد انسان کے لیے کائنات کے کسی مظہر یا مخلوق کے آگے سر جھکانا جائز ہے؟ اور اس کے آگے خاک پر پیشانی رکھنا مناسب ہے؟

نادان انسانوں نے خود ایک دوسرے کو بھی اللہ بنایا تھا چاہے وہ اوتار بن کر آئے ہوں یا تختِ جبروت پر قدم رکھ کر فرعون و نمرود شہنشاہ بنے ہوں، یا تقدس کا لبادہ اوڑھ کر قسیس وراہب کہلائے ہوں یا پوپ اور عالم ودرویش بن کر اپنے کو معبود منوانا چاہا ہو۔ یہ بھی انسانیت کی تحقیر تھی۔ پیغام محمدی ﷺ نے اس کو جڑ سے

[1] النحل 12:16. [2] النحل 14:16. [3] بنیٓ إسرآء یل 70:17.

کاٹ دیا۔ارشادِ الٰہی ہے:

''اور ہم میں سے کوئی کسی کو اللہ کے سوا رب نہ بنائے۔''①

یہاں تک کہ نبیوں کو بھی روا نہیں کہ وہ یہ کہیں:

''اللہ کو چھوڑ کر میرے بندے ہو جاؤ۔''②

آنکھوں سے پوشیدہ ہستیوں میں فرشتے اور آنکھوں کے سامنے کی ہستیوں میں انبیاء علیہم السلام سب سے بلند ہیں مگر وہ بھی انسان کا معبود نہیں ہو سکتے۔اللہ کا ارشاد ہے:

''اور وہ (اللہ) یہ حکم نہیں دیتا کہ فرشتوں اور نبیوں کو رب بناؤ۔''③

الغرض انسانیت کا درجہ پیغام محمدی ﷺ کے ذریعے سے اتنا بلند ہو گیا کہ اس کی پیشانی سوائے ایک اللہ کے کسی کے سامنے نہیں جھک سکتی اور اس کے ہاتھ اس ایک اللہ کے سوا کسی اور کے آگے نہیں پھیل سکتے۔جس سے وہ لینا چاہے اسے کوئی دے نہیں سکتا اور جس کو وہ دینا چاہے اس سے کوئی لے نہیں سکتا۔فرمانِ الٰہی ہے:

''اور وہی ہے جو آسمان میں معبود ہے اور زمین میں بھی معبود ہے۔''④

ایک دوسرے مقام پر فرمایا:

''ہاں، اسی کے لیے ہے پیدا کرنا اور حکم دینا۔''⑤

ایک اور مقام پر فرمایا:

''اس کی سلطنت میں کوئی شریک نہیں۔''⑥

اس پیغام محمدی ﷺ کو سامنے رکھ کر ذرا توحید کے مسئلے کو سمجھو تو معلوم ہوگا کہ اس

① آلِ عمران3:64. ② آل عمران3:79. ③ آل عمران3:80. ④ الزخرف43:84. ⑤ الأعراف 7:54. ⑥ الفرقان25:2.

نے انسانیت کا درجہ کہاں تک بلند کیا، توحید کی حقیقت کو بھی کس طرح کھول دیا ہے۔ یہاں اللہ کے ساتھ کوئی ''قیصر'' نہیں ہے۔ جو کچھ ہے اسی اللہ کا ہے، قیصر کا کچھ نہیں۔ اسی کی حکومت ہے، اسی کی سلطنت ہے اور اسی کی فرمانروائی ہے۔ اسی کا حکم ہے جو فرش سے عرش تک اور زمین سے آسمان تک جاری ہے۔

عزیزو! اپنے سینوں پر ہاتھ رکھ کر بتاؤ کہ انسان خلافت جیسی عظیم نعمت سے سرشار ہو کر کیا کسی غیر اللہ کے آگے جھک سکتا ہے؟ اندھیرا ہو یا روشنی، ہوا ہو یا پانی، بادشاہ ہو یا دشمن، جنگل ہو یا پہاڑ، خشکی ہو یا تری، کیا کبھی ایک صحیح مسلمان کا دل اللہ کے علاوہ کسی چیز سے ڈر سکتا ہے؟ اور کسی ہستی کی پروا کر سکتا ہے؟ ذرا اس روحانی تعلیم کی اخلاقی قوت کو دیکھو اور پیغام محمدی ﷺ کی اس بلندی پر غور کرو۔

② حضرت محمد رسول اللہ ﷺ کا دوسرا اصولی اور بنیادی پیغام یہ ہے کہ انسان اصل خلقت میں پاک، بے گناہ اور اس کی فطرت کی لوح بالکل سادہ ہے۔ وہ خود انسان ہی ہے جو اپنے اچھے اور برے عمل سے فرشتہ یا شیطان، یعنی بے گناہ یا گناہ گار بن جاتا ہے اور اپنی فطرت کے سادہ کاغذ کو سیاہ یا روشن کر لیتا ہے۔ یہ سب سے بڑی خوشخبری اور بشارت ہے جو بنی نوع انسان کو محمد رسول اللہ ﷺ کے ذریعہ ملی۔ چین، برما اور ہندوستان کے تمام مذاہب آواگون اور تناسخ کے چکر میں مبتلا ہیں۔ یونان کے بعض بے وقوف حکیم بھی اس خیال سے مطمئن ہیں۔ مگر اس وہم نے انسانیت کو بے کار کر دیا ہے اور اس کی پیٹھ پر بڑا بھاری بوجھ رکھ دیا ہے۔ اس کے ہر عمل کو دوسرے عمل کا نتیجہ بتا کر اس کو مجبور کر دیا اور اس کی زندگی کو دوسری زندگی کے ہاتھ میں دے دیا ہے۔ اس عقیدے کے مطابق کسی انسان کا دوبارہ پیدا ہونا ہی اس کی گناہ گاری کی دلیل ہے۔

عیسائی مذہب نے بھی انسانیت کے اس بوجھ کو کم نہیں کیا بلکہ اور بڑھا دیا ہے۔ عیسائی مذہب نے یہ عقیدہ تعلیم کیا ہے کہ ہر انسان اپنے باپ آدم علیہ السلام کی گناہ گاری کے سبب سے پیدائشی طور پر گناہ گار ہے، خواہ اس نے ذاتی طور پر کوئی گناہ نہ کیا ہو۔ اس لیے انسانوں کی بخشش اور نجات کے لیے ایک غیر انسان کی ضرورت ہے جو پیدائشی گناہ گار نہ ہوتا کہ وہ اپنی جان دے کر بنی نوع انسان کے لیے کفارہ ہو جائے۔

لیکن محمد رسول اللہ ﷺ نے آ کر غمزدہ انسانوں کو یہ خوشخبری سنائی کہ تم کو بشارت ہو کہ نہ تم اپنی پہلی زندگی کے ہاتھوں مجبور و ناچار ہو اور نہ اپنے باپ آدم علیہ السلام کے گناہ کے باعث فطری گناہ گار ہو بلکہ فطرۃً پاک وصاف اور بے عیب ہو۔ اب تم خود اپنے عمل سے خواہ اپنی صفائی اور پاکی کو برقرار رکھو یا نجس و ناپاک بن جاؤ۔ ارشادِ الٰہی ہے:

''قسم ہے انجیر کی اور زیتون کی۔ اور طورِ سینا کی۔ اور اس امن والے شہر (مکہ) کی۔ کہ بلاشبہ ہم نے انسان کو بہترین اعتدال پر پیدا کیا۔ پھر ہم اس کو نیچے سے نیچے پہنچا دیتے ہیں۔ لیکن وہ جو ایمان لائے اور جنھوں نے نیک عمل کیے۔''[1]

انسانوں کو پیغام محمدی ﷺ کی یہ بشارت ہے کہ انسان بہترین حالت، بہترین اعتدال اور راستی پر پیدا کیا گیا ہے لیکن وہ اپنے عمل کی بنا پر نیک و بد ہو جاتا ہے۔ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے:

''قسم ہے نفس کی اور اس کے ٹھیک بنائے جانے کی۔ پھر ہم نے سمجھ دے دی اس کو بدی اور نیکی کی۔ تو کامیاب ہے وہ جس نے اس (نفس) کو پاک رکھا اور ناکام ہوا وہ جس نے اس کو خاک میں دبا دیا۔''[2]

---

(1) التین 95:1-6. (2) الشمس 91:7-10.

انسانیت کی فطری پاکی کے لیے اس سے زیادہ صاف پیغام اور کیا چاہیے۔ سورۂ دہر میں پھر آتا ہے:

''بلاشبہ ہم نے انسان کو ایک ملے جلے قطرے سے پیدا کیا۔ ہم اسے آزماتے ہیں، چنانچہ ہم نے اسے خوب سننے والا، خوب دیکھنے والا بنا دیا۔ بلاشبہ ہم نے اسے راستہ دکھا دیا، خواہ وہ شکر کرنے والا بنے اور خواہ ناشکرا۔''[1]

سورۂ انفطار میں ہے:

''اے انسان! تجھے تیرے نہایت کرم والے رب کے متعلق کس چیز نے دھوکا دیا؟ وہ جس نے تجھے پیدا کیا، پھر تجھے درست کیا، پھر تجھے برابر کیا۔ جس صورت میں بھی اس نے چاہا تجھے جوڑ دیا۔''[2]

محمد رسول اللہ ﷺ کی الہامی زبان میں دین اور فطرت ایک ہی معنی کے دو لفظ ہیں۔ اصل فطرت دین ہے اور گناہ گاری انسان کی ایک بیماری ہے جو باہر سے آتی ہے۔ قرآن مجید کہتا ہے:

''چنانچہ تو باطل سے ہٹ کر اپنے آپ کو دین پر سیدھا قائم رکھ، وہی اللہ کی فطرت ہے جس پر اس نے لوگوں کو بنایا ہے۔ اللہ کے بنائے میں بدلنا نہیں، یہی سیدھا دین ہے لیکن بہت لوگ نہیں جانتے۔''[3]

پیغمبر اسلام ﷺ نے اپنے ایک پیغام میں اس آیت مبارکہ کا مطلب پورے طور پر واضح کر دیا ہے۔ آپ ﷺ نے فرمایا: ''کوئی بچہ ایسا نہیں جو فطرت پر پیدا نہیں ہوتا، لیکن اس کے ماں باپ اس کو یہودی یا نصرانی یا مجوسی بنا دیتے ہیں۔ جس طرح ہر

[1] الدھر 76:2،3. [2] انفطار 82:6-8. [3] الروم 30:30.

جانور اصل میں صحیح و سالم بچہ پیدا کرتا ہے۔کیا تم نے دیکھا کہ کوئی کان کٹا بچہ بھی وہ جنتا ہے؟'' یہ کہہ کر آپ ﷺ نے پھر اوپر کی آیت پڑھی۔[1]

غور کرو اس پیغام محمدی ﷺ نے بنی نوع انسان کو کتنی بڑی خوشخبری سنائی ہے اور انسان کے دائمی غم کو کس طرح مسرت سے بدل دیا اور ہر انسان کو اپنی زندگی کے عمل میں کس طرح آزاد بنا دیا ہے۔

③ ظہور محمدی ﷺ سے پہلے دنیا کی یہ کل آبادی مختلف گھرانوں میں بٹی ہوئی تھی اور لوگ ایک دوسرے سے نا آشنا تھے۔ ہندوستان کے رشیوں اور منیوں نے آریہ ورت سے باہر اللہ کی آواز کے لیے کوئی جگہ نہیں رکھی تھی۔ ان کے نزدیک پرمیشور صرف پاک آریہ ورت کے باشندوں کی بھلائی چاہتا تھا۔ اللہ کی رہنمائی کا عطیہ صرف اسی ملک اور یہیں کے بعض خاندانوں کے لیے محفوظ تھا۔ زرتشت خاکِ پاک ایران کی پاک نژاد کے سوا اور کہیں اللہ کی آواز نہیں سنتا تھا۔ بنی اسرائیل اپنے خاندان سے باہر کسی رسول اور نبی کی بعثت اور ظہور کا حق نہیں سمجھتے تھے۔ یہ پیغام محمدی ﷺ ہی ہے جس نے مشرق، مغرب، شمال، جنوب ہر طرف اللہ کی آواز سنائی اور بتایا کہ اللہ کی رہنمائی کے لیے ملک، قوم اور زبان کی الگ پہچان کی ضرورت نہیں۔ اس کی نگاہ میں فلسطین، ایران، ہندوستان اور عرب سب برابر ہیں۔ ہر جگہ اس کے پیغام کی رہنمائی کا نور چمکا۔ ارشادِ الٰہی ہے:

''اور کوئی قوم نہیں گزری مگر اس میں ایک ڈرانے والا گزرا ہے۔''[2]

دوسرے مقام پر فرمایا:

---

[1] صحيح البخاري، حديث:4775. [2] فاطر35:24.

"اور ہر قوم کے لیے ایک رہنما ہے۔"[1]

ایک اور جگہ ارشاد ہوتا ہے:

"اور ہم نے آپ سے پہلے کتنے رسول ان کی اپنی اپنی قوم کے پاس بھیجے۔"[2]

ایک یہودی اپنی قوم سے باہر کسی پیغمبر کو تسلیم نہیں کرتا۔ ایک عیسائی کے لیے بنی اسرائیل کے یا دوسرے ملکوں کے رہنماؤں کو تسلیم کرنا ضروری نہیں اور ایسا کرنے سے اس کے سچے عیسائی ہونے میں کوئی فرق نہیں آتا۔ ہندو دھرم کے لوگ آریہ ورت کے باہر اللہ کی کسی آواز کے قائل نہیں۔ ایران کے زردشتی کو اپنے ہاں کے سوا دنیا ہر جگہ اندھیری معلوم ہوتی ہے، لیکن یہ محمد رسول اللہ ﷺ ہی کا پیغام ہے کہ ساری دنیا ایک ہی اللہ کی مخلوق ہے اور اللہ کی نعمتوں میں ساری قومیں اور نسلیں برابر کی شریک ہیں۔ ایران ہو یا ہندوستان، چین ہو یا یونان، عرب ہو یا شام ہر جگہ اللہ کا نور یکساں چمکا۔ جہاں جہاں بھی انسانوں کی آبادی تھی، اللہ نے اپنے قاصد بھیجے، اپنے رہنما اتارے اور ان کے ذریعے اپنے احکام سے سب کو مطلع فرمایا۔

اسلام کی اسی تعلیم کا نتیجہ ہے کہ کوئی مسلمان اس وقت تک مسلمان نہیں ہوسکتا جب تک دنیا کے تمام پیغمبروں پر، پہلی آسمانی کتابوں پر اور گزشتہ ربانی الہاموں پر یقین نہ رکھے۔ جن جن پیغمبروں کے قرآن مجید میں نام ہیں، ان کو نام بنام اور جن کے نام نہیں معلوم، یعنی قرآن مجید نے نہیں بتائے، وہ کہیں بھی گزرے ہوں، ان کے جو نام بھی ہوں، ان سب کو سچا اور راست باز ماننا ضروری ہے۔ مسلمان کون ہیں؟

"جو ایمان رکھتے ہیں اس پر جو (اے محمد ﷺ) تم پر اترا اور اس پر جو تم سے

[1] الرعد 7:13. [2] الروم 47:30.

پہلے اترا۔''[1]

پھر سورۂ بقرہ میں فرمایا:

''لیکن نیکی اس کی ہے جو اللہ پر اور قیامت کے دن پر اور فرشتوں پر اور کتاب پر اور تمام نبیوں پر ایمان لایا۔''[2]

اسی سورت کے آخر میں ہے کہ پیغمبر اور اس کے پیرو:

''سب ایمان لائے اللہ پر اور اس کے فرشتوں پر اور اس کی کتابوں پر اور اس کے رسولوں پر اور (وہ کہتے ہیں:) ہم اس کے رسولوں میں باہم فرق نہیں کرتے۔''[3]

یعنی یہ نہیں کرسکتے کہ بعض پر ایمان لائیں اور بعض پر نہیں۔ تمام مسلمانوں کو حکم ہوتا ہے:

''اے ایمان لانے والو! ایمان لاؤ اللہ پر اور اس کے رسول پر اور اس کتاب پر جو اس نے اپنے رسول پر اتاری اور اس کتاب پر جو پہلے اتاری گئی۔''[4]

عزیزو! دنیا کی اس روحانی مساوات، انسانی اخوت و برادری اور تمام سچے مذہبوں، رہنماؤں اور پیغمبروں کے اس حقیقی ادب و تعظیم اور ان کی یکساں صداقت کا سبق محمد رسول اللہ ﷺ کے سوا اور کس نے دیا ہے؟ اب بتاؤ کہ پیغمبر اسلام ﷺ کی رحمت عام، ہمدردی اور وفاداری کا دائرہ کتنا وسیع ہے کہ اس سے انسانوں کی کوئی بستی اور بنو آدم کا کوئی گھرانہ خالی نہیں۔

④ تمام مذہبوں نے عبد و معبود اور اللہ و بندے کے درمیان واسطے قائم کر رکھے تھے۔

① البقرة 2:4. ② البقرة 2:177. ③ البقرة 2:285. ④ النسآء 4:136.

قدیم بت خانوں میں کاہن اور پجاری تھے۔ یہودیوں نے بنی لاوی اوران کی نسل کو اللہ اور بندے کے درمیان عبادتوں اور قربانیوں کا واسطہ بنایا تھا۔عیسائیوں نے بعض حواریوں اوران کے جانشین پوپوں کو یہ رتبہ دیا کہ وہ جو زمین پر باندھیں گے، وہ آسمان پر باندھا جائے گا اور جو زمین پر کھولیں گے، وہ آسمان پر کھولا جائے گا۔ ان کو تمام انسانوں کے گناہ معاف کرنے کا اختیار دیا گیا،ان کے بغیر کوئی عبادت قبول نہیں ہوسکتی۔

ہندوؤں میں برہمن خاص اللہ کے داہنے ہاتھ سے پیدا ہوئے ہیں۔ اللہ اور بندے کے درمیان وہی واسطہ ہیں۔ ان کی وساطت کے بغیر کوئی ہندو عبادت نہیں ہوسکتی۔ مگر اسلام میں پجاریوں، کاہنوں، پوپوں اور پادریوں کی کوئی جماعت نہیں ہے۔ یہاں اعلیٰ کلاس کا وجود نہیں۔ یہاں کھولنے اور باندھنے کا اختیار صرف اللہ کو ہے۔ یہاں گناہوں کی معافی کا حق صرف اللہ کو ہے۔ عبد و معبود اور اللہ اور بندے کی عبادت اور راز و نیاز میں کسی غیر کو دخل نہیں۔ ہر شخص جو مسلمان ہے، نماز کا امام ہوسکتا ہے۔ قربانی کرسکتا ہے۔ نکاح پڑھا سکتا ہے۔ مذہب کے تمام مراسم بجالا سکتا ہے۔ یہاں انسانوں کو ﴿ادْعُونِي أَسْتَجِبْ لَكُمْ﴾ ''اے لوگو (بلاواسطہ) مجھ کو پکارو، میں تم کو جواب دوں گا۔''[1] کی صدائے عام ہے۔ ہر شخص اپنے اللہ سے باتیں کرسکتا ہے، اپنی دعاؤں میں اسے پکار سکتا ہے۔ اس کے آگے جھک سکتا ہے اور دل کی عقیدت کے نذرانے بے واسطہ پیش کرسکتا ہے۔ یہاں عبد و معبود اور اللہ اور بندے کے درمیان کوئی حائل نہیں اور یہ سب سے بڑی آزادی ہے جو محمد رسول اللہ ﷺ کے ذریعے سے انسانوں کو عطا ہوئی، یعنی یہ کہ اللہ کے معاملے میں انسانوں کو انسانوں کی غلامی

[1] المؤمن 60:40.

سے نجات ملی۔

⑤ انسانوں کی تعلیم و ہدایت کے لیے جو مقدس ہستیاں وقتاً فوقتاً آتی رہیں، ان کے متعلق ابتدا سے قوموں میں حد درجہ عقیدت مندی کی زیادتی اور کمی رہی ہے۔ زیادتی یہ تھی کہ نادانوں نے ان کو خود اللہ یا اللہ کا مثل یا اللہ کا روپ اور مظہر ٹھہرایا۔ بابل، اسیریا اور مصر کے ہیکلوں میں کاہنوں کی شان مثیل خدا کے نظر آتی ہے۔ ہندوؤں میں وہ اوتار کے رنگ میں مانے جاتے ہیں۔ بودھوں اور چینیوں نے اپنے اپنے بودھوں اور مہابیروں کو خود خدا تسلیم کر لیا۔ عیسائیوں نے اپنے پیغمبر کو اللہ کا بیٹا ٹھہرایا۔ دوسری طرف صورت حال یہ ہے کہ بنی اسرائیل کے نزدیک ہر وہ شخص جو پیش گوئی کر سکتا تھا، نبی اور پیغمبر تھا۔ ایک نبی کی نبوت کے لیے اتنا ہی کافی تھا کہ وہ پیش گوئی کرتا ہے، خواہ وہ گناہ گار ہو، اخلاقی حیثیت سے قابل اعتراض ہو۔ اللہ کی نگاہ میں اس کا کیسا ہی درجہ ہو، اس کا نیک اور معصوم ہونا بھی ضروری نہ تھا۔ اسی لیے بنی اسرائیل کے موجودہ صحیفوں میں بڑے بڑے پیغمبروں کے متعلق ایسی حکایتیں ملتی ہیں جو حد درجہ جھوٹی اور بے ہودہ ہیں۔

اسلام نے اس منصب عظیم کی صحیح حیثیت مقرر کی اور بتایا کہ انبیاء نہ اللہ ہیں، نہ اللہ کے مثیل ہیں، نہ اللہ کے اوتار ہیں، نہ اللہ کے بیٹے اور رشتہ دار ہیں۔ وہ آدمی ہیں اور محض آدمی ہیں۔ وہ بشر ہیں اور خالص بشریت کے جامے میں ہیں۔ تمام انبیاء بشر تھے اور آخری پیغمبر نے خود اپنے متعلق کہا کہ میں بشر ہوں۔ کفار تعجب سے کہتے تھے: کیا بشر رسول؟ اسلام نے کہا: ہاں۔ ارشاد ہوا:

"کہہ دیجیے (اے پیغمبر) میں بھی تمھاری ہی طرح بشر ہوں۔"[1]

[1] الکھف 110:18۔

ایک اور مقام پر فرمایا:

''میں تو ایک بشر کے سوا کچھ نہیں جو رسول ہے۔''[1]

اللہ کے کارخانے کی کوئی چیز انبیاء کے اختیار میں نہیں۔ ان کو کسی غیر معمولی طاقت بشری کام پر قدرت نہیں۔ انھوں نے جو کچھ کیا وہ اللہ کے اذن و اشارے سے۔ دوسری طرف یہ بتایا گیا ہے کہ وہ گو انسان اور بشر ہیں، لیکن اپنے کمالات کی حیثیت سے تمام انسانوں سے بالاتر ہیں۔ وہ اللہ سے مکالمہ کرتے ہیں۔ ان پر اللہ کی وحی نازل ہوتی ہے۔ وہ بے گناہ اور معصوم ہوتے ہیں تاکہ گناہ گاروں کے لیے نمونہ بنیں۔ ان کے ہاتھوں سے اللہ اپنے اذن اور اشارے سے اپنی قدرت کے عجائبات دکھاتا ہے۔ وہ لوگوں کو نیکی کی تعلیم دیتے ہیں، ان کی عزت و تعظیم اور اطاعت سب پر فرض ہے، وہ اللہ کے خاص، سچے اور فرمان بردار بندے ہیں جن کو اللہ تعالیٰ اپنی رسالت اور پیغمبری کے منصب سے سرفراز کرتا ہے۔

یہ ہے اعتدال اور درمیانی راہ جو پیغام محمدی ﷺ نے انبیاء علیہم السلام اور رسولوں کی نسبت قائم کی ہے جو ہر قسم کی کمی اور زیادتی سے پاک ہے اور اس مذہب کے مناسب ہے جس نے دنیا میں توحید کی تکمیل کی۔

[1] بنیٓ إسرآء یل 93:17.

سیرت نبوی ﷺ اور ایمان و عمل

دوستو! آج میری اور آپ کی ملاقات کا سلسلہ ختم ہوتا ہے۔ آج میں اسلام کے بنیادی امور کے مطابق تمام باتیں آپ کے سامنے پیش کردوں گا۔

مسئلہ توحید کے متعلق تمام پہلے مذاہب میں جو حقیقت میں توحید کا پیام لے کر اس دنیا میں آئے تھے، تین اسباب سے غلط فہمیاں اور گمراہیاں پیدا ہوئیں۔ایک جسمانی تشبیہ و تمثیل، دوسرے صفات کو ذات سے الگ اور مستقل ماننا اور تیسرے افعال کی نیرنگی سے دھوکا کھانا۔ پیغام محمدی ﷺ نے ان گرہوں کو کھولا، ان غلط فہمیوں کو دور کیا اوران حقیقتوں کو واضح کیا۔سب سے پہلے تشبیہ و تمثیل کو لیجیے۔

① اللہ کو، اللہ کی صفتوں کو اور اللہ و بندے کے باہمی تعلق کو واضح کرنے کے لیے خیالی یا مادی تشبیہات و تماثیل دوسرے مذاہب کے معتقدوں نے ایجاد کیں۔ نتیجہ یہ ہوا کہ اصل معبود تو جاتا رہا لیکن اس کی جگہ یہ تشبیہیں اور تمثیلیں معبود بن گئیں۔ انھی تشبیہوں اور تمثیلوں نے مجسم ہوکر بتوں کی شکل اختیار کر لی اور پھر بت پرستی شروع ہوگئی۔ اللہ کو اپنے بندوں کے ساتھ جو لطف و کرم اور محبت و پیار ہے اس کو بھی تشبیہ و تمثیل کے رنگ میں ادا کر کے مجسم کردیا گیا۔ آرین قوموں میں چونکہ عورت محبت کی دیوی ہے، اس

لیے اللہ اور بندے کے تعلق کو ماں اور بیٹے کے لفظ سے ادا کیا گیا اور اس لیے معبود ماتا کی شکل میں آ گیا۔ بعض دوسرے ہندو فرقوں میں اس بے کیف محبت کو زن وشوہر اور میاں بیوی کے الفاظ میں ادا کیا گیا۔ سدا سہاگ فقیروں نے ساڑھی اور چوڑی پہن کر اسی حقیقت کو نمایاں کیا ہے۔ رومیوں اور یونانیوں نے بھی عورت ہی کی شکل میں اللہ ظاہر کیا ہے۔ سامی قوموں میں عورت کا برملا ذکر تہذیب کے خلاف ہے، اس لیے خاندان کی اصل بنیاد باپ قرار دیا گیا ہے۔ اسی طرح بابل، اسیریا اور شام کے کھنڈروں میں اللہ مرد کی صورت میں جلوہ نما ہے۔ بنی اسرائیل کے ابتدائی تخیل میں اللہ باپ اور تمام فرشتے اور انسان اس کی اولاد بتائے گئے ہیں۔ بعد کو باپ اللہ کی اولاد صرف بنی اسرائیل قرار پاتی ہے۔ بنی اسرائیل کے بعض صحیفوں میں زن وشوہر کا تخیل بھی اللہ اور بنی اسرائیل کے درمیان نظر آتا ہے۔ یہاں تک کہ بنی اسرائیل اور یروشلم بیوی فرض کیے جاتے ہیں اور اللہ شوہر بنتا ہے۔ عیسائیوں میں باپ اور بیٹے کی تمثیل نے اصل اور حقیقت کی جگہ لے لی۔ عربوں میں بھی اسی قسم کا تخیل تھا۔ اللہ باپ تصور کیا جاتا تھا اور فرشتے اس کی بیٹیاں۔ پیغام محمدی ﷺ نے ان تمام تشبیہی اور تمثیلی صورتوں، طریقوں اور محاوروں کو یک قلم ختم کر دیا اور ان کا استعمال شرک قرار دیا۔ اس نے صاف صاف اعلان کیا:

﴿ لَيْسَ كَمِثْلِهِ شَيْءٌ ﴾

''اسی جیسی (اور اس کی مثل) کوئی چیز نہیں۔''[1]

اس ایک آیت نے شرک کی ساری بنیادوں کو ہلا دیا۔ پھر ایک نہایت ہی چھوٹی

[1] الشوریٰ 42:11.

سورت کے ذریعے سے انسانوں کے سب سے بڑے وہم کو دور کیا:

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ

﴿قُلْ هُوَ اللّٰهُ اَحَدٌ ۝ اَللّٰهُ الصَّمَدُ ۝ لَمْ يَلِدْ ۙ وَلَمْ يُوْلَدْ ۝ وَلَمْ يَكُنْ لَّهٗ كُفُوًا اَحَدٌ ۝﴾

اللہ کے نام سے شروع جو بڑا مہربان نہایت رحم والا ہے۔

''کہہ دیجیے (اے پیغمبر ﷺ!) اللہ ایک ہے۔ اللہ ہی (ہر چیز سے) بے نیاز ہے۔ نہ اس نے کسی کو جنا اور نہ وہ جنا گیا۔ اور نہ کبھی کوئی ایک اس کے برابر کا ہے۔''[1]

اس سورت میں جو قرآن کریم کی چھوٹی سی سورت ہے، توحید کی نکھری ہوئی صورت ظاہر ہوئی ہے جس کے بنا پر دین محمدی ﷺ ہر قسم کے شرک کے مغالطوں سے پاک ہو گیا ہے۔

دوستو! اس کے یہ معنی نہیں ہیں کہ پیغام محمدی ﷺ نے اللہ اور بندے کے درمیان محبت، پیار اور لطف و کرم کے تعلقات کو توڑ دیا ہے۔ نہیں، اس نے ان تعلقات کو اور زیادہ مضبوط کر دیا ہے۔ لیکن ان تعلقات کے ادا کرنے میں جو جسمانی تعبیریں مختلف انسانی شکلوں میں تھیں، ان کو توڑ دیا ہے۔ اس لیے کہ اول تو یہ انسانی طریقۂ ادا حقیقت سے بہت کم رتبہ ہے، یعنی اس کی نگاہ میں عبد و معبود کے درمیان جو تعلق ہے، اس کے مقابلے میں باپ، بیٹے، ماں، بیٹیوں یا بیوی و شوہر کا تعلق بالکل کم درجہ ہے۔ دوسرے یہ کہ ان تعبیروں سے شرک کی غلطیاں پیدا ہوتی ہیں۔ اسی لیے اسلام

[1] الإخلاص 112.

نے یہ کہا:

”تم اللہ کو اسی طرح یاد کرو جیسے اپنے باپوں کو یاد کرتے ہو بلکہ اس سے بہت بڑھ کر یاد کرو۔“[1]

دیکھو! اس آیت کریمہ میں محبت الٰہی کو ادا کرنا تھا تو یہ نہیں کہا کہ ”اللہ تمھارا باپ“ یعنی اللہ اور باپ کے رشتے کو مشبہ اور مشبہ بہ نہیں بنایا بلکہ اللہ کی محبت اور باپ کی محبت کو باہم مشبہ اور مشبہ بہ قرار دیا ہے۔ اس سے ظاہر ہوا کہ اس نے جسمانی رشتے کو گو چھوڑ دیا لیکن اس جسمانی رشتے کی محبت کو باقی رکھا۔ آگے بڑھ کر اس نے کہا: بلکہ باپ سے بہت زیادہ اللہ سے محبت رکھنی چاہیے: ﴿أَوْ أَشَدَّ ذِكْرًا﴾ اس سے ظاہر ہوا کہ اس رشتہ کی محبت کو وہ اللہ اور بندے کی محبت اور تعلق کے مقابلے میں کم رتبہ اور ہیچ سمجھتا ہے اور اس میں ترقی کی ضرورت محسوس کرتا ہے۔ ارشاد ہوتا ہے:

”اور ایمان والے سب سے زیادہ اللہ سے محبت رکھتے ہیں۔“[2]

اسلام، اللہ کو ”ابو العالمین“ دنیا کا باپ نہیں کہتا بلکہ ”رب العالمین“ دنیا کا پالنے والا کہتا ہے کیونکہ اس کی نگاہ میں ”اَب“ سے ”رب“ کا رتبہ بہت بلند ہے۔ باپ کا تعلق اپنے بیٹے سے فانی اور عارضی ہے مگر رب کا تعلق اپنے مربوب سے اس کی خلقت اور وجود کے اولین لمحے سے لے کر آخرین لمحے تک برابر قائم رہتا ہے۔ اسلام کا اللہ وَدود ہے، یعنی محبت والا، رؤف ہے، یعنی ایسی رأفت اور محبت والا جو باپ کو اپنے بیٹے سے ہے۔ حنّان ہے، یعنی ایسی محبت والا جیسی ماں کو اپنے بیٹے سے ہے مگر وہ نہ باپ ہے اور نہ ماں بلکہ ان تشبیہوں سے پاک ہے۔

---

[1] البقرة2:200. [2] البقرة2:165.

② حضرات! قدیم مذاہب کے عقیدۂ توحید میں غلط فہمیوں کا دوسرا سبب صفات کا مسئلہ ہے، یعنی صفات کو ذات الٰہی سے الگ مستقل وجود کے طور پر تسلیم کرنا۔ ہندوؤں کے عام مذہب میں جو خداؤں کا لاتعداد لشکر نظر آتا ہے، وہ حقیقت میں اسی غلطی کا نتیجہ ہے کہ ہر ایک صفت کو انھوں نے ایک علیحدہ اور مستقل وجود مان لیا اور اس طرح ایک خدا کے 23 کروڑ خدا بن گئے۔ تعداد چھوڑ کر صفات کی تشبیہ اور تمثیل بھی انھوں نے مجسم کر کے پیش کی۔ اللہ کی صفتِ قوت کو ظاہر کرنا تھا تو انھوں نے اسے واقعی ہاتھ کے ذریعے ظاہر کیا اور اس کی جسمانی تمثیل میں کئی کئی ہاتھ بنا دیے۔ اللہ کی حکمت بالغہ کو سمجھانا تھا تو ایک سر کے بجائے دوسر کی مُورت کھڑی کر دی۔

ہندو مذہب کے فرقوں پر غور کرو تو معلوم ہوگا کہ وہ اسی ایک مسئلہ صفات کے مستقل وجود کے تخیل سے مختلف فرقوں میں بٹ گئے ہیں۔ اللہ کی تین بڑی صفات ہیں: پیدا کرنے والا، قائم رکھنے والا اور فنا کر دینے والا۔ ہندو فرقوں نے ان صفات کو تین مستقل شخصیتیں تسلیم کر لیا اور برہما، وشنو اور شیو، یعنی خالق، قائم رکھنے والا اور مارنے والا تین مستقل ہستیاں بن گئیں اور برہمن، وشنو پرست اور شیو پرست تین الگ الگ فرقے ہو گئے اور تینوں کے پوجنے والے الگ ہو گئے۔ لنگایت فرقے نے تخلیق کی صفت کو اپنا معبود ٹھہرا کر مرد وعورت کے آلاتِ تولید کو اس خالق کا مظہر مان لیا اور ان کی تصویر پوجنی شروع کر دی۔

عیسائیوں نے اللہ کی تین بڑی صفتوں، یعنی حیات، علم اور ارادے کو تین مختلف شخصیتیں تسلیم کر لیا۔ حیات باپ ہے، علم روح القدس ہے اور ارادہ بیٹا ہے۔ اسی قسم کی چیزیں رومی، یونانی اور مصری تخیل میں بھی ملتی ہیں۔ لیکن محمد رسول اللہ ﷺ کے

پیغام نے اس غلطی کا پردہ چاک کر دیا اور صفات کی نیرنگی سے دھوکا کھا کر ایک کو چند سمجھنا انسان کی جہالت اور نادانی قرار دیا۔ قرآن نے کہا:

﴿ اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعٰلَمِيْنَ ۝ ﴾

''سب خوبیاں اسی ایک پروردگار عالم اللہ کے لیے ہیں۔''[1]

﴿ وَ لِلّٰهِ الْمَثَلُ الْاَعْلٰى ﴾

''سب اچھی صفتیں اللہ کے لیے ہیں۔''[2]

﴿ اَللّٰهُ نُوْرُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ ﴾

''اللہ ہی آسمانوں اور زمین کا نور ہے''[3]

عرب میں اسی ہستی کو صفتِ رحم سے تعبیر کر کے عیسائی اس کو رحمان کہتے تھے۔ عام مشرکین عرب اس کو اللہ کہتے تھے۔ قرآن مجید نے کہا:

''کہہ دیجیے کہ اللہ کو پکارو یا رحمٰن کو پکارو، تم جس کو بھی پکارو گے تو یہ بہترین نام اسی کے ہیں۔''[4]

ایک دوسرے مقام پر فرمایا:

''چنانچہ اللہ ہی اصل کارساز ہے اور وہی مردوں کو زندہ کرے گا اور وہی ہر چیز پر پوری قدرت رکھنے والا ہے۔''[5]

اسی سورت میں ارشاد ہوتا ہے:

''سن لو! بے شک اللہ ہی بے حد بخشنے والا، نہایت رحم کرنے والا ہے۔''[6]

---

① الفاتحة 2:1. ② النحل 60:16. ③ النور 35:24. ④ بنيٓ إسرآء يل 110:17. ⑤ الشورٰی 9:42. ⑥ الشورٰی 5:42.

سورۃ الزخرف میں فرمایا:

''اور وہی ہے جو آسمان میں معبود ہے اور زمین میں بھی معبود ہے اور وہی کمال حکمت والا، سب کچھ جاننے والا ہے۔''①

مزید ارشاد ہوتا ہے:

'' وہی سب کچھ سننے والا، سب کچھ جاننے والا ہے۔ آسمانوں و زمین اور ان چیزوں کا رب جو ان دونوں کے درمیان ہیں، اگر تم یقین کرنے والے ہو۔ اس کے سوا کوئی معبود نہیں۔ وہی زندہ کرتا اور مارتا ہے۔ وہی تمھارا اور تمھارے پہلے باپ دادا کا رب ہے۔''②

یعنی وہی برہما ہے، وہی شیو ہے اور وہی وشنو ہے۔ تینوں ایک ہی کی صفتیں ہیں۔ صفات کے تعدد اور اختلاف سے موصوف میں تعدد اور اختلاف نہیں۔ اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے:

''اللہ ہی کے لیے سب خوبی ہے جو رب ہے آسمانوں کا، رب ہے زمین کا اور رب ہے سارے جہان کا۔ اور اسی کو ہے سب بڑائی آسمانوں میں اور زمین میں اور وہی زبردست اور حکمت والا ہے۔''③

آگے ارشاد ہوتا ہے:

'' وہی ہے اللہ جس کے سوا کوئی معبود نہیں، ہر چھپی اور کھلی چیز کو جاننے والا ہے۔ وہی ہے بے حد رحم والا، نہایت مہربان۔ وہی اللہ ہے جس کے سوا کوئی معبود نہیں ، بادشاہ ہے، نہایت پاک، سلامتی والا، امن دینے والا، نگہبان،

① الزخرف 84:43. ② الدخان 44:6-8. ③ الجاثیة 45:26,27.

سب پر غالب، اپنی مرضی چلانے والا، بے حد بڑائی والا ہے، پاک ہے اللہ اس سے جو وہ شریک ٹھہراتے ہیں۔ وہ اللہ ہے جو خالق ہے، عدم سے لانے والا ہے، صورت گری کرنے والا ہے، سب اچھے نام اسی کے ہیں۔ اس کی تسبیح ہر وہ چیز کرتی ہے جو آسمانوں اور زمین میں ہے، وہی سب پر غالب، کمال حکمت والا ہے۔" (1)

ان صفتوں والے اللہ کو ہم نے صرف پیغام محمدی ﷺ ہی کے ذریعے سے جانا ہے، ورنہ دوسروں نے تو ذات سے صفات کو الگ کر کے ایک معبود کے چند ٹکڑے کر ڈالے تھے۔ ﴿سُبْحٰنَ اللّٰهِ عَمَّا يُشْرِكُوْنَ﴾ سے مراد وہی شرک ہے جو صفات کو ذات سے الگ کر کے لوگوں نے اختیار کیا تھا۔ اس آخری پیغام نے بتایا کہ وہی اللہ ہے، وہی خالق ہے، وہی باری ہے، وہی مصور ہے، وہی مَلِک ہے، وہی قُدوس ہے، وہی مُومن ہے، وہی عزیز و جبار ہے اور وہی رحمان ورحیم ہے۔ ایک ہی ذات کی یہ سب صفتیں ہیں اور وہ ایک ہے۔

③ شرک کا تیسرا سرچشمہ افعال الٰہی کی نیرنگی ہے۔ لوگوں نے غلطی سے یہ سمجھا کہ ان مختلف افعال کے کرنے والے مختلف ہستیاں ہیں۔ کوئی مارتی ہے، کوئی زندہ کرتی ہے، کوئی لڑائی کرواتی ہے، کوئی صلح کرواتی ہے، کسی کا کام محبت ہے، کسی کا کام دشمنی ہے، کوئی علم کا دیوتا ہے، کوئی دولت کی دیوی ہے۔ غرض ہر کام کے الگ الگ سیکڑوں معبود ہیں۔ اسلام نے ان نادانوں کو بتایا کہ یہ سب ایک ہی اللہ کے کام ہیں۔

تمام افعال کی دو بڑی قسمیں ہیں۔ ایک خیر اور ایک شر۔ یا یوں کہو کہ ایک اچھی اور

(1) الحشر 59:22-24.

دوسری بری۔ اس خیال سے کہ ایک ہی ذات سے خیر و شر کے دو متضاد کام نہیں ہو سکتے، زردشتیوں نے خیر اور اچھے کاموں اور اچھی چیزوں کے لیے الگ معبود ٹھہرایا، شر اور برے کاموں اور بری چیزوں کے لیے الگ معبود ٹھہرایا۔ پہلے کا نام یزدان اور دوسرے کا نام اہرمن رکھا اور دنیا کو اس یزدان اور اہرمن کی باہمی کشمکش کی معرکہ گاہ ٹھہرایا۔ یہ غلطی اس لیے ہوئی کہ وہ خیر وشر کی حقیقت نہیں سمجھ سکے۔

دوستو! خیر وشر دنیا میں کوئی چیز نہیں ہے۔ کوئی شے اپنی اصل کے لحاظ سے نہ خیر ہے نہ شر۔ وہ خیر اور شر انسانوں کے صحیح استعمال یا غلط استعمال سے بن جاتی ہے۔ فرض کرلو کہ آگ ہے، اگر اس سے کھانا پکاؤ یا انجن چلاؤ یا غریب کو تاپنے کو دو تو یہ خیر ہے اور اگر اسی سے کسی غریب کا گھر جلا دو تو یہ شر ہے۔ تلوار خود نہ خیر ہے نہ شر، تم اس کو جیسا استعمال کرو ویسی ہی ہے۔ تاریکی نہ خیر ہے نہ شر۔ اگر تم اس کو لوگوں کے گھر میں چوری کا ذریعہ بناؤ تو شر اور اگر اپنے کو چھپا کر نیکیوں کے کرنے کا وقت بناؤ یا انسان کے حواس کے آرام وسکون اور راحت کا ذریعہ بناؤ تو خیر ہے۔

اللہ نے یہ کائنات بنائی، آسمان وزمین بنائے، مادّہ کو پیدا کیا، اشیاء میں خاصیتیں رکھیں اور ان کو مختلف قوتیں بخشیں، پھر انسان کو بنایا، اس کو دل و دماغ بخشا، عقل وحکمت دی۔ اب دیکھو کہ ایک انسان اس کائنات کی ترتیب، اشیاء کی ترکیب اور خاصیتوں کو دیکھ کر ایک خالق وقادر کی صنعت کاری اور صورت گری پر تعجب کرتا ہوا ﴿ فَتَبٰرَكَ اللّٰهُ اَحْسَنُ الْخٰلِقِيْنَ ﴾ [1] پڑھ کر حضرت ابراہیم علیہ السلام کی طرح یہ پکار اٹھتا ہے:

”میں نے اپنا منہ سب طرف سے پھیر کر اس ذات کی طرف کرلیا جس نے

[1] المؤمنون 23:14.

آسمانوں کو اور زمین کو پیدا کیا اور میں مشرکوں میں نہیں ہوں۔''①

دوسری طرف اسی مادّہ اور اس کی قوتوں اور خاصیتوں کی ظاہر داریوں میں پھنس کر انسان کے دل ودماغ کی عقل وحکمت اللہ کا انکار کر بیٹھتی ہے اور مادّہ ہی کو اصل کائنات اور مسائل کا سبب سمجھنے لگتی ہے اور یہ کہہ اٹھتی ہے:

''اس دنیاوی زندگی کے علاوہ پھر کوئی دوسری زندگی نہیں، ہم مرتے اور جیتے ہیں اور ہم کو زمانے کے سوا کوئی نہیں مارتا۔''②

کائنات اور اس کے عجائبات اور خواص ہر شخص کے سامنے ایک ہی ہیں، البتہ دماغ ہزاروں ہیں۔ان کو دیکھ کر ایک دماغ اللہ پرست ہوجاتا ہے اور دوسرا گمراہ اور دہریہ بن جاتا ہے۔غور کرو تو معلوم ہوگا کہ ایک ہی چیز ہے جو ہدایت کرنے والی اور گمراہ کرنے والی ہے۔ یا یوں کہو کہ کائنات اپنی اصل کے لحاظ سے نہ ہدایت کرنے والی ہے نہ گمراہ کرنے والی۔تم اپنی عقل کے اختلاف سے ہدایت پاتے ہو یا گمراہ ہوجاتے ہو۔جس طرح اللہ کے اس کام کے دونوں نتیجے ہیں، اسی طرح اللہ کے پیغام کے بھی دونوں نتیجے ہیں۔ اسی قرآن یا انجیل کو پڑھ کر ایک انسان اللہ کو پہچانتا ہے اور تسلی پاتا ہے اور دوسرے کے دل میں شبہات پیدا ہوتے ہیں ، خطرات آتے ہیں اور انکار کی طرف مائل ہو جاتا ہے۔ پیغام ایک ہے، البتہ دل دو ہیں اور یہ دونوں دل اور دونوں دماغ ایک ہی خالق کی مخلوق ہیں۔ دو خالق نہیں ہیں۔نتیجہ کیا نکلا؟ یہ نکلا کہ یہ تمام نیرنگیاں ایک ہی قدرت کے تماشے ہیں۔ خیر و شر دونوں اسی کے ہاتھ میں ہیں۔ ہدایت اور گمراہی دونوں ادھر ہی سے ہیں:

① الأنعام6:79. ② الجاثیة45:24.

''(اپنے اس کلام کے ذریعے) وہ (اللہ) بہتوں کو راہِ راست نہیں دکھاتا (یا گمراہ کرتا ہے) اور بہتوں کو راہ راست دکھاتا ہے۔ انھی کو راہِ راست نہیں دکھاتا جو اللہ کے عہد کو باندھ کر توڑتے ہیں۔ جو اس کو کاٹتے ہیں جس کے جوڑنے کا اللہ نے حکم دیا ہے اور جو زمین میں فساد کرتے ہیں، یہی ہیں گھاٹا اٹھانے والے۔''[1]

ایک دوسرے مقام پر فرمایا:

''اور اللہ کافروں کو ہدایت نہیں دیتا۔''[2]

ان آیتوں سے معلوم ہوگا کہ ہدایت اور گمراہی دونوں کے لیے ابتدائی محرکات تمھارے ہی ہوتے ہیں۔ تم نے فسق کیا، قطع رحم کیا، فساد کیا، کفر کیا تو اس کے بعد گمراہی آئی۔ گمراہی پہلے اور فسق و فجور بعد کو نہیں آیا۔

اللہ نے انسان کو پیدا کیا اور بتا دیا کہ یہ راستہ منزل مقصود کو جاتا ہے اور یہ گہرے غار میں ان کو لے جا کے گرا دیتا ہے۔ فرمایا:

''بلاشبہ ہم نے اسے راستہ دکھا دیا، خواہ وہ شکر کرنے والا بنے اور خواہ ناشکرا۔''[3]

تمام دنیا کی اچھی بری چیزوں کا وہی ایک خالق ہے۔ ارشاد ہوا:

''یہی ہے اللہ تمھارا رب، ہر چیز کا پیدا کرنے والا، اس کے سوا کوئی معبود نہیں۔''[4]

ایک اور مقام پر فرمایا:

''حالانکہ اللہ ہی نے تم کو پیدا کیا اور اسے بھی جو تم کرتے ہو۔''[5]

① البقرۃ 2:26،27. ② البقرۃ 2:264. ③ الدھر 76:3. ④ المؤمن 40:62. ⑤ الصّٰفّٰت 37:96.

لیکن ساتھ یہ بھی فرمایا:

''اس نے ہر چیز کو اس کی شکل و صورت بخشی، پھر راستہ دکھایا۔''①

اب تم ہو جو اس کو ہدایت اور گمراہی اور خیر وشر بنا لیتے ہو۔ اگر غلط راہ پر چلے تو گمراہی ہوئی، صحیح راہ پر چلے تو ہدایت ہوئی۔ صحیح مصرف میں استعمال کیا تو خیر، اور غلط استعمال کیا تو شر۔ ورنہ کوئی چیز اپنی اصل کی رو سے نہ ہدایت ہے نہ ضلالت، خیر ہے نہ شر۔ اس لیے خیر و شر کو دو چیزیں سمجھ کر دو معبودوں کی ضرورت نہیں بلکہ ایک ہی اللہ ہے جو ان دونوں کا خالق ہے:

''کیا اللہ کے سوا کوئی پیدا کرنے والا ہے جو تم کو آسمان اور زمین سے روزی دیتا ہو؟ اس کے سوا کوئی معبود نہیں تو تم کہاں بہکائے جاتے ہو۔''②

اللہ نے اپنا پیغام تمھارے سپرد کر دیا، اب تم اس کو مانو یا نہ مانو۔ ارشاد الٰہی ہے:

''پھر ہم نے اس کتاب کے وارث اپنے وہ بندے بنائے جنھیں ہم نے چن لیا۔ پھر ان میں سے کوئی اپنے آپ پر ظلم کرنے والا ہے، اور ان میں سے کوئی میانہ رو ہے اور ان میں سے کوئی اللہ کے حکم سے نیکیوں میں آگے نکل جانے والا ہے۔''③

ایک اور مقام پر فرمایا:

''اور جو تمھیں کوئی مصیبت پہنچی تو وہ اس کی وجہ سے ہے جو تمھارے ہاتھوں نے کمایا اور وہ بہت سی چیزوں سے درگزر کر جاتا ہے۔''④

سورۃ الشّمس میں ارشاد ہوتا ہے:

① طٰہٰ 50:20. ② فاطر 3:35. ③ فاطر 32:35. ④ الشوریٰ 30:42.

''پھر (ہر نفس میں) اس کی نافرمانی اور اس کی پرہیز گاری (کی پہچان) اس کے دل میں ڈال دی۔ یقیناً وہ کامیاب ہو گیا جس نے اسے پاک کر لیا اور یقیناً وہ نامراد ہو گیا جس نے اسے مٹی میں دبا دیا۔''[1]

④ اللہ کی عبادت ہر مذہب میں تھی اور ہے، لیکن قدیم مذاہب میں ایک عام غلط فہمی پھیل گئی تھی کہ عبادت کا مقصود جسم کو تکلیف دینا ہے، یا دوسرے لفظوں میں یہ کہو کہ یہ خیال پیدا ہو گیا تھا کہ جس قدر اس ظاہری جسم کو تکلیف دی جائے گی، اسی قدر روحانی ترقی ہوگی اور دل کی اندرونی صفائی اور پاکی بڑھے گی۔ اسی کا نتیجہ یہ ہے کہ ہندوؤں میں عام طور سے جوگ اور عیسائیوں میں رہبانیت پیدا ہوئی اور بڑی بڑی مشکل ریاضتوں کا وجود ہوا اور ان کو روحانی ترقی کا ذریعہ سمجھا گیا۔ کوئی عمر بھر نہانے سے پرہیز کر لیتا تھا۔ کوئی عمر بھر ٹاٹ یا کمبل اوڑھے رہتا تھا۔ کوئی ہر موسم میں یہاں تک کہ شدید سردی میں بھی ننگا رہتا تھا۔ کوئی عمر بھر کھڑا رہتا تھا۔ کوئی عمر بھر کے لیے غار میں بیٹھ جاتا تھا۔ کوئی ساری عمر دھوپ میں کھڑا رہتا تھا۔ کوئی عمر بھر کے لیے کسی چٹان پر بیٹھ جاتا تھا۔ کوئی عہد کر لیتا تھا کہ پوری زندگی صرف درختوں کی پتیاں کھا کر گزارا کرے گا۔ کوئی عمر بھی تنہائی میں گزار دیتا تھا اور قطع نسل کو عبادت سمجھتا تھا۔ کوئی ایک ہاتھ ہوا میں کھڑا کر کے سکھا ڈالتا تھا۔ کوئی حبس دَم، یعنی سانس روکنے کو عبادت جانتا تھا۔ کوئی درخت پر الٹا لٹک جاتا تھا۔ یہ تھا اسلام سے پہلے خدا پرستی کا اعلیٰ اور روحانیت کی سب سے ترقی یافتہ شکل۔ لیکن پیغام محمدی ﷺ نے آ کر انسانوں کو ان مصیبتوں سے نجات دلائی اور بتایا کہ یہ روحانیت نہیں بلکہ جسمانی تماشے ہیں۔ ہمارے اللہ کو

[1] الشمس 91:8-10.

جسم کی شکل نہیں بلکہ دل کا رنگ مرغوب ہے۔ طاقت سے زیادہ تکلیف اس کی شریعت میں نہیں۔ ارشاد ہوتا ہے:

''اللہ کسی جان کو اس کی وسعت سے زیادہ تکلیف نہیں دیتا۔'' ①

اسلام نے اس رہبانیت کو بدعت قرار دیا اور کہا:

''اور رہبانیت (دنیا سے کنارہ کشی) تو انھوں نے خود ہی ایجاد کر لی تھی، ہم نے اسے ان پر نہیں لکھا تھا۔'' ②

اور نبیِ کریم ﷺ نے اعلان فرما دیا:

''اسلام میں رہبانیت نہیں۔'' ③

جن لوگوں نے اللہ کی پیدا کی ہوئی جائز لذتوں کو اپنے اوپر حرام کر لیا تھا، ان سے قرآن نے یہ سوال کیا:

''کس نے حرام کی اللہ کی زینت جو اس نے اپنے بندوں کے لیے پیدا کی۔'' ④

یہاں تک کہ خود پیغمبر اسلام ﷺ نے ایک دفعہ اپنے اوپر شہد حرام کر لیا تو تنبیہ ہوئی:

''اے نبی ﷺ! آپ کیوں حرام کرتے ہیں جو اللہ نے آپ کے لیے حلال کیا ہے؟'' ⑤

پیغامِ محمدی ﷺ نے سب سے پہلی دفعہ دنیا کو بتایا کہ عبادت کا مقصود فقط ایک ہے اور وہ یہ ہے کہ بندہ اللہ کے آگے اپنی بندگی کا اقرار کرے۔ ارشاد ہوتا ہے:

''بے شک جو لوگ میری عبادت سے تکبر کرتے ہیں، عنقریب ذلیل ہو کر جہنم

---

① البقرة 286:2. ② الحديد 27:57. ③ سنن أبي داود، حديث: 2917. ④ الأعراف 32:7.
⑤ التحريم 1:66.

میں داخل ہوں گے۔‘‘ [1]

یعنی عبادت یہی ہے کہ بندے میں سرکشی نہ ہو۔ یہی چیز عبادات کے مختلف ارکان کو بجا لا کر انسان ظاہر کرتا ہے کہ وہ اللہ سے سرکش نہیں بلکہ اس کا اطاعت گزار اور فرمان بردار ہے۔ اسلام میں عبادت کا مقصد اور نتیجہ کیا ہے؟ فقط حصول تقویٰ۔ ارشاد ہوتا ہے:

’’اے لوگو! اپنے رب کی عبادت کرو جس نے تم کو پیدا کیا اور ان لوگوں کو بھی جو تم سے پہلے تھے تاکہ تم کو تقویٰ حاصل ہو۔‘‘ [2]

نماز سے فائدہ یہ ہے:

’’یقیناً نماز بے حیائی اور برائی سے روکتی ہے۔‘‘ [3]

روزوں سے مقصود یہ ہے:

’’اے لوگو جو ایمان لائے ہو! تم پر روزہ رکھنا لکھ دیا گیا ہے، جیسے ان لوگوں پر لکھا گیا جو تم سے پہلے تھے تاکہ تم کو تقویٰ حاصل ہو۔‘‘ [4]

حج سے مطلب یہ ہے:

’’تاکہ وہ اپنے بہت سے فائدوں میں حاضر ہوں اور چند معلوم دنوں میں ان پالتو چوپاؤں پر اللہ کا نام ذکر کریں جو اس نے انھیں دیے ہیں۔‘‘ [5]

زکاۃ سے مقصود اپنے دل کی صفائی اور غریبوں کی مدد ہے۔ ارشاد الٰہی ہے:

’’جو اپنا مال اس لیے دیتا ہے کہ پاک ہو جائے حالانکہ اس کے ہاں کسی کا کوئی احسان نہیں ہے کہ اس کا بدلہ دیا جائے۔ مگر وہ تو صرف اپنے اس رب

[1] المؤمن 40:60. [2] البقرۃ 2:21. [3] العنکبوت 29:45. [4] البقرۃ 2:183. [5] الحج 22:28.

کا چہرہ طلب کرنے کے لیے دیتا ہے جو سب سے بلند ہے۔''[1]

نکاح کرنا اور نسل کو ترقی دینا اسلام کے پیغمبر ﷺ کی سنت ہے۔ آپ ﷺ نے فرمایا:

''نکاح میرا طریقہ ہے۔ جس نے میرے اس طریقہ پر عمل نہ کیا، وہ مجھ سے نہیں۔''[2]

قرآن مجید نے اولاد و ازواج کو آنکھوں کی ٹھنڈک بتایا اور مسلمانوں کو اس خواہش کا متمنّی قرار دیا:

''اور وہ جو کہتے ہیں اے ہمارے رب! ہمیں ہماری بیویوں اور اولادوں سے آنکھوں کی ٹھنڈک عطا فرما۔''[3]

دوسری عبادتوں کی طرح ایک عبادت قربانی بھی تھی۔ لوگ اپنے آپ کو دیوتاؤں پر قربان کر دیتے۔ اپنی اولاد کو اپنی ملک سمجھتے اور ان کو بھینٹ چڑھا دیتے تھے۔ دیوتاؤں کو خون کے چھینٹے دیے جاتے تھے۔ جو جانور قربانی کیے جاتے تھے، ان کا گوشت جلایا جاتا تھا کہ ان کا دھواں دیوتاؤں کو خوش آتا تھا۔ یہودی اسی لیے قربانی کے گوشت کو جلاتے تھے۔ لیکن حضرت محمد رسول اللہ ﷺ نے آکر بتایا کہ قربانی سے مقصود کیا ہے؟ آپ کے پیغام نے انسانوں کی قربانی قطعاً ختم کر دی۔ جانوروں کی قربانی جائز رکھی، مگر نہ تو ان کے خون کے چھینٹے دینے کا حکم دیا اور نہ گوشت کے جلانے کا حکم دیا۔ اللہ تعالیٰ نے قربانی کی یہ مصلحت بتائی:

''اور قربانی کے بڑے جانور، ہم نے انھیں تمھارے لیے اللہ کی نشانیوں سے بنایا ہے۔ تمھارے لیے ان میں بڑی خیر ہے۔ چنانچہ ان پر اللہ کا نام لو اس

---

① اللیل 92:18-20. ② سنن ابن ماجه، حدیث:1846. ③ الفرقان 25:74.

حال میں کہ گھٹنا باندھے کھڑے ہوں، پھر جب ان کے پہلو گر پڑیں تو ان سے کچھ کھاؤ اور قناعت کرنے والے کو کھلاؤ اور مانگنے والے کو بھی۔ اسی طرح ہم نے انھیں تمھارے لیے مسخر کر دیا تا کہ تم شکر کرو۔ اللہ کو ہرگز نہ ان کے گوشت پہنچیں گے اور نہ ان کے خون اور لیکن اسے تمھاری طرف سے تقویٰ پہنچے گا۔ اسی طرح اس نے انھیں تمھارے لیے مسخر کر دیا تا کہ تم اس پر اللہ کی بڑائی بیان کرو کہ اس نے تمھیں ہدایت دی اور نیکی کرنے والوں کو خوشخبری سنا دیں۔''[1]

اسی قربانی کے غلط عقیدے نے یہ مسئلہ پیدا کر دیا تھا کہ ہر انسان کو اپنی جان پر آپ قابو ہے اور وہ اس کی ملکیت ہے، اسی طرح اس کی اولاد کی جان بھی اس کی ملکیت ہے۔ بیوی کی جان اس کے شوہر کی ملکیت ہے۔اس ایک غلط اصول نے خودکشی، دخترکشی، اولاد کو بھینٹ چڑھا دینا یا ان کو مار ڈالنا اور شوہر کے مرنے کے بعد بیوی کا شوہر کے ساتھ جل مرنا جیسے سیکڑوں انسانیت کش رسوم پیدا کر دیے تھے۔ پیغام محمدی ﷺ نے ان سب کی بیخ کنی کر دی۔

اس نے اپنا اصول مقرر کیا کہ تمام جانیں صرف اللہ کی ملکیت ہیں اور ان کا قتل صرف اللہ کے حق کی بنا پر ہو سکتا ہے،اسی لیے غیر اللہ کے نام پر جو جانور ذبح کیا جائے اس کا کھانا ناجائز ہے۔خودکشی کرنے والوں پر اپنی جنت بھی اس نے حرام کر دی۔ اسلام کے سوا تمام دنیا میں اور اس وقت بھی یورپ اور امریکہ جیسے مہذب ملکوں میں مشکلات سے بچنے کے لیے بہترین تدبیر خودکشی سمجھی جاتی ہے۔ قانون اس کو روکنا چاہتا ہے اور نہیں روک سکتا کیونکہ ہر شخص اپنی جان کو اپنی ملکیت سمجھ رہا ہے

---

[1] الحج 22:36،37.

اور اس کو دنیا کی مصیبتوں سے چھٹکارے کا ذریعہ یقین کرتا ہے اور سمجھتا ہے کہ اس موت کے بعد یا تو کوئی زندگی نہیں اور اگر ہے تو اللہ ہم سے ہمارے اس فعل کی کچھ باز پرس نہ کرے گا۔ مگر اسلام نے بتایا کہ یہ جان ہماری نہیں بلکہ اللہ کی ملکیت ہے، اس لیے خودکشی کے ذریعے سے مصیبتوں سے چھٹکارے کا خیال غلط ہے کیونکہ اس طرح سے اپنی جان دینے پر دوسری دنیا میں مصیبتوں سے بھی زیادہ پر مصیبت زندگی شروع ہو جائے گی۔ ارشاد ہوتا ہے:

''اور جو زیادتی اور ظلم سے ایسا (اپنے آپ کو ہلاک) کرے گا تو عنقریب ہم اسے آگ میں جھونکیں گے اور یہ اللہ پر ہمیشہ سے بہت آسان ہے۔''[1]

بیٹیوں کا قتل عرب میں جاری تھا، ہندوستان کے راجپوتوں میں بھی جاری تھا، دنیا کے اور ملکوں میں جاری تھا۔ عرب میں تو یہ سنگدلی تھی کہ لڑکیوں کو زندہ دفن کر دیتے تھے۔ پیغام محمدی ﷺ کے ایک ہی فقرے نے اس رسم باطل کا ہمیشہ کے لیے خاتمہ کر دیا۔ ارشاد ہوا:

''اور جب زندہ دفن کی گئی (لڑکی) سے پوچھا جائے گا کہ وہ کس گناہ کے بدلے قتل کی گئی؟''[2]

اپنی اولاد کو قتل کرنا عرب میں جرم نہ تھا۔ آج بھی اس تہذیب کے عالم میں کثرت سے بچے اس لیے قتل کیے جاتے ہیں کہ ان کی پرورش کا کوئی سامان نہیں۔ کہا جاتا ہے کہ ملک میں پیداوار کم ہے۔ اس لیے مردم شماری کو بڑھنے سے روکنا چاہیے۔ عرب میں اور دوسری قوموں کے قانون میں بچہ کو پیٹ سے گرا دینے یا ایسے بچے کے قتل پر

---

[1] النسآء 4:30. [2] التکویر 81:8,9.

کوئی پرسش نہ تھی۔ یونان میں نومولود بچوں کا معاینہ کیا جاتا تھا اور ان میں سے کمزور بچوں کے جینے کا کوئی حق نہیں سمجھا جاتا تھا۔اس کو پہاڑ سے نیچے گرا کا مار ڈالتے تھے اور آج بھی ضبط تولید (برتھ کنٹرول) کے نام سے یہی کچھ کیا جارہا ہے۔اسلام نے یہ اصول بتایا کہ روزی کوئی کسی کو نہیں دیتا:

''اور زمین میں چلنے والا کوئی جاندار نہیں مگر اس کا رزق اللہ ہی پر ہے۔''[1]

اس لیے اس نے کہا:

''اور اپنی اولاد کو مفلسی کے ڈر سے قتل نہ کرو، ہم ہی انھیں رزق دیتے ہیں اور تمھیں بھی۔ بے شک ان کا قتل ہمیشہ سے بہت بڑا گناہ ہے۔''[2]

دنیا کی عظیم الشان غلطیوں میں سے جو اَب بھی دنیا کے اس حصے میں قائم ہیں جہاں محمد ﷺ کا پیغام قبول نہیں کیا گیا، ایک یہ ہے کہ لوگوں نے اللہ کے بندوں کے درمیان حسب ونسب ، مال ودولت،رنگ وروپ اورصورت وشکل کی دیواریں قائم کردی ہیں۔ ہندوؤں نے ابتدا سے آج تک اپنے سوا سب کو ملیچھ اور ناپاک قرار دیا اور خود اپنے کو چار ذاتوں میں تقسیم کرکے ان میں عزت اور حقوق کی ترتیب قائم کی۔ شودروں کو مذہب کا بھی حق نہ تھا۔قدیم ایران میں بھی یہ چار ذاتیں اسی طرح قائم تھیں۔ رومنس نے اپنے کو آقائی اور اپنے سوا سب قوموں کو غلامی کے لیے مخصوص کرلیا۔ بنی اسرائیل نے صرف اپنے آپ کو اللہ کی اولاد قرار دیا اور سب کو چنڈال قرار دیا اور خود اپنی قوم کے اندر بھی مختلف بیرونی مدارج قائم کردیے۔ خود یورپ کا اس تہذیب اورانسانی محبت و مساوات کے دعوے کے باوجود کیا حال ہے؟ سفید آدمی

① هود 11:6. ② بنيٓ إسرآء يل 17:31.

تہذیب و تمدن کا ٹھیکیدار قرار دیا گیا ہے۔ کالی قومیں اس کی برابری کے لائق نہیں ہیں۔ ایشیائی قومیں ان کے ساتھ سفر میں بھی ایک جگہ نہیں بیٹھ سکتیں۔ بعض ملکوں میں ان کے محلوں میں رہ بھی نہیں سکتیں اور ان کے حقوق کی برابری نہیں کرسکتیں۔ امریکہ کے انسانیت پرستوں کی نگاہ میں وہاں کے حبش باشندوں کو جینے کا بھی حق نہیں ہے اور جنوبی و مشرقی افریقہ میں تو حبشیوں بلکہ ہندوستانیوں بلکہ ایشیائیوں کو بھی انسانی حقوق کی برابری نہیں مل سکتی۔ حقوقِ دنیاوی سے گزر کر یہ تفرقے اللہ کے گھروں میں بھی قائم ہیں۔ کالوں کے گرجے الگ ہیں اور گوروں کے الگ۔ اللہ کے یہ دونوں کالے اور گورے بندے ایک ساتھ ایک اللہ کے آگے نہیں جھک سکتے۔ پیغام محمدی ﷺ نے ان تمام تفرقوں کو مٹا دیا۔ اس کے نزدیک حسب ونسب، مال و دولت، شکل وصورت ان میں سے کوئی چیز امتیاز نہیں پیدا کرسکتی۔ وہ قریش جن کو اپنے حسب ونسب پر غرور وناز تھا۔ فتح مکہ کے دن کعبہ کے حرم میں کھڑے ہوکر ان کو آپ ﷺ نے یہ بتایا:

”اے قریش کے لوگو! اب جاہلیت کا غرور اور نسب کا فخر اللہ تعالیٰ نے مٹا دیا ہے۔ تمام انسان آدم علیہ السلام کی نسل سے ہیں اور آدم علیہ السلام مٹی سے بنے ہیں۔“ [1]

حجۃ الوداع کے مجمع میں پھر اعلان کیا:

”اے لوگو! تمھارا رب ایک ہے، تمھارا باپ ایک ہے۔ خبردار! عربی کو عجمی پر اور عجمی کو عربی پر، سرخ کو کالے پر اور کالے کو سرخ پر کوئی فضیلت نہیں ہے سوائے تقویٰ کے۔“ [2]

[1] سيرة ابن هشام: 54/4. [2] مسند أحمد: 411/5.

پھر بتایا کہ اصلی فرق عمل کا ہے:

''اللہ نے جاہلیت کے زمانے کے غرور اور نسب کے فخر کو مٹا دیا۔ انسان اب یا متقی ایماندار ہے اور یا گناہ گار بد بخت ہے۔ تمام انسان آدم علیہ السلام کے بیٹے ہیں اور آدم علیہ السلام مٹی سے پیدا ہوئے تھے۔''[1]

وحیِ محمدی ﷺ نے تمام انسانوں کو مخاطب کر کے بتایا:

''اے لوگو! بے شک ہم نے تمھیں ایک نر اور ایک مادے سے پیدا کیا اور ہم نے تمھیں قومیں اور قبیلے بنا دیا تا کہ تم ایک دوسرے کو پہچانو۔ بے شک تم میں سب سے زیادہ عزت والا اللہ کے نزدیک وہ ہے جو تم میں سب سے زیادہ تقویٰ والا ہے۔''[2]

دوسری جگہ ارشاد ہوتا ہے:

''اور نہ تمھارے مال ایسے ہیں اور نہ تمھاری اولاد جو تمھیں ہمارے ہاں قرب میں نزدیک کر دیں مگر جو شخص ایمان لایا اور اس نے نیک عمل کیا تو یہی لوگ ہیں جن کے لیے دوگنا بدلہ ہے۔''[3]

تمام مسلمانوں کو بھائی بھائی کا رتبہ دیا اور یہ پیغام ملا:

﴿ اِنَّمَا الْمُؤْمِنُوْنَ اِخْوَةٌ ﴾

''مومن تو بھائی ہی ہیں۔''[4]

اور آپ نے اسی کے مطابق حجۃ الوداع میں ایک لاکھ انسانوں کے سامنے یہ

① جامع الترمذي، حديث: 3270. ② الحجرات 13:49. ③ سبا 37:34. ④ الحجرات 10:49.

اعلان کیا:

«اَلْمُسْلِمُ اَخُوْ الْمُسْلِمِ»

”ہر مسلمان دوسرے مسلمان کا بھائی ہے۔“[1]

اس برابری اور برادری نے کالے، گورے، عجمی، عربی اور ترکی، تاتاری، زنگی اور فرنگی کا فرق اٹھا دیا اور اللہ نے ان پر اپنا یہ احسان جتایا کہ

﴿ فَاَصْبَحْتُمْ بِنِعْمَتِهٖٓ اِخْوَانًا﴾

”تو تم اس کی نعمت سے بھائی بھائی بن گئے۔“[2]

اللہ کے گھر میں کوئی فرق نہیں، حسب ونسب کا کوئی فرق نہیں، پیشہ اورمنصب کا کوئی فرق نہیں، غربت اور امارت کا کوئی فرق نہیں، اللہ کے آگے سب برابر ہیں۔ یہاں نہ کوئی برہمن ہے نہ شودر۔ قرآن مجید سب کے ہاتھ میں دیا جائے گا۔ نماز سب کے پیچھے پڑھی جائے گی۔ رشتہ ناتا ہر ایک کا ہوسکتا ہے۔ علم ہر ایک کا ہے اور حقوق سب کے یکساں ہیں، یہاں تک کہ خون بھی سب کا برابر ہے:

﴿ اَنَّ النَّفْسَ بِالنَّفْسِ﴾

”جان کے بدلے جان۔“[3]

عزیز نوجوانو! میرا دل چاہتا ہے کہ تمھارے سامنے پیغام محمدی ﷺ کے احسانات کو ایک ایک کر کے گنا دوں مگر افسوس کہ فرصت نہیں اور اس بحرِ ناپیدا کنار کی انتہا بھی نہیں۔ عورتوں کو جو حقوق پیغام محمدی ﷺ نے دیے ہیں اور غلاموں کو جس حد تک اس نے عزت دی ہے جی چاہتا تھا کہ اس کو بھی تمھارے سامنے پھیلاؤں اور دکھاؤں کہ

[1] صحیح البخاري، حدیث:2442. [2] اٰل عمرٰن 3:103. [3] المآئدة 5:45.

یورپ کے بلند بانگ دعوے اب بھی اسلام کے اوجِ خیال سے نیچے ہیں، مگر افسوس کہ وقت نہیں۔

دنیا میں جس چیز نے سب سے زیادہ گمراہی پھیلائی، وہ دین اور دنیا کا فرق ہے، دین کا کام الگ کیا گیا اور دنیا کا کام الگ۔ اللہ کا حکم الگ ٹھہرایا گیا اور بادشاہ کا حکم الگ۔ دنیا کے حصول کا الگ راستہ بتایا گیا اور دین کے حصول کا الگ۔

نونہالان اسلام! یہ سب سے بڑی غلطی تھی جو دنیا میں پھیلی تھی۔ اس غلطی کا پردہ پیغام محمدی ﷺ کی نور افگن شعاعوں نے چاک کر دیا۔ اس نے بتایا کہ اخلاص اور نیک نیتی کے ساتھ دنیا کے کاموں کو اللہ کے بتائے ہوئے اصول کے مطابق انجام دینا دین ہے، یعنی اللہ کے اصول کے مطابق دنیا داری ہی دین داری ہے۔

لوگ سمجھتے ہیں کہ ذکر و فکر، گوشہ نشینی، کسی غار اور پہاڑ کے کھوہ میں بیٹھ کر اللہ کو یاد کرنا، دینداری ہے اور دوست و احباب، آل و اولاد، ماں باپ، قوم و ملک اور خود اپنی مدد آپ، فکر معاش اور پرورشِ اولاد دنیا داری ہے۔ اسلام نے اس غلطی کو مٹایا اور بتایا کہ اللہ کے حکم کے مطابق ان حقوق اور فرائض کو بخوبی ادا کرنا بھی دین داری ہی ہے۔

اسلام میں نجات کا مدار دو چیزوں پر ہے: ایمان اور عمل صالح۔ ایمان پانچ چیزوں پر اعتقاد رکھنے کا نام ہے:

① اللہ پر۔

② نیکی کی راہ بتانے والے پیغمبروں پر۔

③ پیغمبروں تک اللہ کا پیغام لانے والے فرشتوں پر۔

④ ان کتابوں پر جن میں اللہ کے یہ پیغام ہیں۔

⑤ اس پیغام الٰہی کے مطابق عمل کرنے والوں یا عمل نہ کرنے والوں کی جزا اور سزا پر۔

انھی پانچ باتوں پر یقین رکھنا ایمان ہے۔ اسی ایمان پر عمل کی بنیاد قائم ہے کیونکہ اس ایمان و یقین کے بغیر نیک نیتی اور خلوص کے ساتھ کوئی عمل نہیں ہوسکتا۔ دوسری چیز عمل ہے، یعنی یہ کہ ہمارے کام صالح اور نیک ہوں۔ عمل کے تین حصے ہیں: ایک عبادت، یعنی وہ عمل جن کے ذریعے اللہ کی بڑائی اور بندگی کا اظہار ہوتا ہے۔ دوم معاملات، یعنی انسانوں کے آپس کے لین دین، کاروبار اور نظم ملت کے قوانین اور قاعدے جن کی وجہ سے انسانی معاشرت بربادی اور ہلاکت سے بچی رہتی ہے اور ظلم مٹ کر عدل قائم ہوتا ہے۔ سوم اخلاق، یعنی وہ حقوق جو باہم ایک دوسرے پر اگرچہ قانونی حیثیت سے فرض نہیں ہیں، مگر روح کی تکمیل اور معاشرت کی ترقی کے لیے ضروری ہیں۔ یہی چار چیزیں، یعنی ایمان، عبادات، معاملات اور اخلاق کی سچائی اور درستی ہماری نجات کا ذریعہ ہیں۔

نوجوانو! مجھے صفائی کے ساتھ یہ کہنے دو کہ خاموشی، سکون، خلوت نشینی اور انفرادی زندگی اسلام نہیں ہے۔ اسلام جدوجہد، سعی و عمل اور سرگرمی ہے، وہ موت نہیں حیات ہے۔ اس کا فرمان یہ ہے:

''انسان کے لیے صرف وہی ہے جس کی اس نے کوشش کی۔''[1]

ایک جگہ یوں فرمایا:

''ہر شخص اس کے بدلے جو اس نے کمایا، گروی رکھا ہوا ہے۔''[2]

① النجم 29:53. ② المدثر 38:74.

اسلام سرتا پا جہاد اور مجاہدہ ہے لیکن خلوت میں بیٹھ کر نہیں بلکہ میدان میں نکل کر۔ محمد رسول اللہ ﷺ کی زندگی تمھارے سامنے ہے۔ خلفائے راشدین کی زندگیاں تمھارے سامنے ہیں۔ صحابہ رضی اللہ عنہم کی زندگیاں تمھارے سامنے ہیں۔ وہی تمھارے لیے نمونہ ہے، اسی میں تمھاری نجات ہے، وہی تمھارا ذریعۂ فلاح ہے اور وہی ترقیِ سعادت کی راہ ہے۔ محمد ﷺ کا پیغام بودھ کے پیغام کی طرح ترکِ خواہش نہیں بلکہ اصلاحِ خواہش ہے۔ محمد ﷺ کا پیغام حضرت مسیح علیہ السلام کے پیغام کی طرح دولت اور قوت کی تحقیر اور ممانعت نہیں بلکہ ان کے حصول اور صَرف کے طریقوں کی درستی اور اس کا صحیح استعمال ہے۔

نوجوان دوستو! ایمان اور اس کے مطابق عمل صالح یہی اسلام ہے۔ اسلام عمل ہے، ترکِ عمل نہیں۔ ادائے واجبات ہے، عدمِ واجبات نہیں۔ ادائے فرض ہے، ترکِ فرض نہیں۔ اس عمل اور ان واجبات اور فرائض کی تشریح تمھارے پیغمبر ﷺ اور ان کے یاران باصفا کی زندگیوں اور سیرتوں میں ملے گی جن کا نقشہ یہ ہے:

> ''محمد اللہ کے رسول ہیں اور وہ لوگ جو ان کے ساتھ ہیں، کافروں پر بہت سخت ہیں، آپس میں نہایت رحم دل ہیں۔ آپ انھیں اس حال میں دیکھیں گے کہ رکوع کرنے والے ہیں۔ سجدے کرنے والے ہیں۔ اپنے رب کا فضل اور اس کی رضا ڈھونڈتے ہیں۔''[1]

کافرانِ حق کے ساتھ جہاد بھی قائم ہے۔ آپس میں برادرانہ الفت کے جذبات بھی ہیں۔ اللہ کے سامنے رکوع میں جھکے اور سجدے میں گرے بھی ہیں اور پھر دنیا میں اللہ

---

[1] الفتح 48:29.

کی مہربانی اور رضا کے طالب بھی ہیں۔ اللہ کی مہربانی (فضل) قرآن مجید کی اصطلاح میں روزی اور معاش کو کہتے ہیں اور اس معاش میں بھی دین کی طلب جاری ہے۔ ارشاد ہوتا ہے:

''وہ لوگ جنھیں اللہ کے ذکر سے اور نماز قائم کرنے اور زکاۃ دینے سے نہ کوئی تجارت غافل کرتی ہے اور نہ کوئی خرید و فروخت۔''①

تجارت، خرید و فروخت اور کاروبار بھی جاری ہیں اور اللہ کی یاد بھی قائم ہے۔ وہ ایک کو چھوڑ کر دوسرے کو نہیں ڈھونڈ ھتے بلکہ دونوں کو ساتھ ساتھ رکھتے ہیں۔ اس لیے کہ

''مسلمان کتاب شریعت ہاتھ میں لے کر زندگی کی راہوں پر چلتا ہے۔''

مسلمانوں اور رومیوں میں جنگ ہے، صحابہ فوج کے سپاہی ہیں، رومی سپہ سالار ان مسلمان سپاہیوں کی حالت دیکھنے کے لیے اسلامی کیمپ میں چند جاسوس بھیجتا ہے۔ وہ یہاں مسلمانوں کو دیکھ کر واپس جاتے ہیں تو سرتاپا اثر میں ڈوبے ہوتے ہیں۔ وہ جا کر رومی سپہ سالار کو بتاتے ہیں کہ مسلمان کیسے سپاہی ہیں: ''وہ راتوں کو اللہ تعالیٰ کی عبادت کرتے ہیں اور دن کے وقت شہسواری کرتے ہیں۔ یہی اسلام اور اس کی اصل روح ہے۔''

تمت بالخیر

① النور24:37.

ہم سب سرائے ارضی کے مسافر ہیں۔ اور ہمیں کُنْ فِي الدُّنيَا كَأَنَّكَ غَرِيبٌ ہی کی تاکید فرمائی گئی ہے۔ قدرتی طور پر ہماری تمنا ہے کہ ہم اس دنیا میں بھی کامیاب رہیں اور مرنے کے بعد اللہ رب العزت کے حضور پیش ہوں تو اس کی بارگاہِ عالی سے ہمیں مغفرت اور جنت کا پروانہ مل جائے۔ یہ بڑا وسیع، رفیع اور وقیع مقصد ہے۔ اس مقصد میں کامیابی کے لیے ہمیں رہنمائی کی جو روشنی درکار ہے وہ کہاں سے ملے گی؟ یہ کتاب اسی سوال کا جواب ہے۔ یہ بتاتی ہے کہ ہماری رہبری کا سرچشمہ صرف محمد رسول اللہ ﷺ کی ذاتِ بابرکات ہے۔ اگر آپ نوجوان ہیں تو مکہ کے اس پاکیزہ نوجوان کو دیکھیں جس کی آنکھیں حیا کے بوجھ سے جھکی رہتی تھیں۔ آپ خاوند ہیں تو سیدہ خدیجہ رضی اللہ عنہا اور سیدہ عائشہ رضی اللہ عنہا کے عالی مقام شوہر کو دیکھیں۔ آپ بال بچے دار ہیں تو سیدہ فاطمہ رضی اللہ عنہا کے عظیم باپ اور حسن و حسین رضی اللہ عنہما کے مقدس نانا کو دیکھیں۔ آپ تاجر ہیں تو شام کی مارکیٹ میں حضرت خدیجہ رضی اللہ عنہا کا مالِ تجارت بیچنے والے کا مثالی کردار ملاحظہ کریں۔ آپ کسی عدالت کے جج ہیں تو حجر اسود کی تنصیب کا فیصلہ کرنے والے صادق و امین کو اپنا مرکزِ نگاہ بنائیں۔ آپ معلم ہیں تو درسگاہِ صفہ کے عالمگیر معلم کی سیرت کا مطالعہ کریں۔ فی الجملہ یہ کتاب سیرتِ محمدی ﷺ کی نہایت مستند اور جامع دستاویز ہے۔ اِسے توجہ سے پڑھیے اور زندگی کے ہر گوشے میں اسوۂ حسنہ ہی پر عمل کیجیے۔

ISBN: 978-9960-500-68-3

9 789960 500683

دارالسلام
کتاب و سنت کی اشاعت کا عالمی ادارہ
ریاض • جدہ • شارجہ • لاہور • کراچی
اسلام آباد • لندن • هیوسٹن • نیو یارک